یکم جنوری ۲۰۲۶ء | بسم اللہ الرحمن الرحیم | جلد نمبر: ۱۹ ۔ شمارہ نمبر: ۱

پندرہ روزہ

معارف فیچر کراچی

MA'ARIF FEATURE

مدیر: سیّد شاہد ہاشمی

نائب مدیران: منعم ظفر خان، محمود الحق صدیقی، نوید نون ۔ معاون مدیران: غیاث الدین، م ع فاروقی

ڈی ۔ ۳۵، بلاک ۔ ۵، فیڈرل 'بی' ایریا، کراچی ۔ ۷۵۹۵۰

فون: ۳۶۸۰۹۲۰۱۔۳۶۳۴۹۸۴۰ (۲۱۔۹۲)

برقی پتا: irak.pk@gmail.com، ویب گاہ: www.irak.pk

۱ ۔ **معارف فیچر** ہر ماہ کی یکم اور سولہ تاریخوں کو شائع کیا جاتا ہے۔ اس میں دنیا بھر سے (ہمیں) دستیاب ایسی معلومات کا انتخاب پیش کیا جاتا ہے، جو اسلام سے دلچسپی اور ملت اسلامیہ کا درد رکھنے والوں کے غور و فکر کے لیے اہم یا مفید ہو سکتی ہیں۔

۲ ۔ پیش کیا جانے والا لوازمہ بالعموم بلا تبصرہ شائع کیا جاتا ہے۔ کسی مضمون، نقطۂ نظر، خیال یا معلومات کے انتخاب کی وجہ اس سے ہمارا اتفاق نہیں، اس کی اہمیت ہوتی ہے۔ کسی مضمون یا معلومات کی مدلل تردید یا اس سے اختلاف پر مبنی لوازمہ کو بھی جگہ دی جا سکتی ہے۔

۳ ۔ **معارف فیچر** کو بہتر بنانے کے لیے مفید معلومات کے حصول یا ان کے ذرائع تک رسائی میں آپ کی مدد کا خیر مقدم کیا جائے گا۔

۴ ۔ ہمارے فراہم کردہ لوازمے کے مزید، لیکن غیر تجارتی ابلاغ کی عام اجازت ہے۔

۵ ۔ **معارف فیچر** کی کوئی قیمت مقرر نہیں۔ تاہم عطیات کی ضرورت بھی رہتی ہے اور عطیات قبول بھی کیے جاتے ہیں۔ **اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی**

نیا سال، نئے عالمی اِمکانات

دنیا بھر میں سیاسی اور معاشی معاملات کچھ کے کچھ ہوتے جا رہے ہیں۔ امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے عشروں سے چلے آ رہے اُصولوں اور طریقوں کو خیر باد کہتے ہوئے، بلکہ کچلتے ہوئے اپنے طریقے متعارف کرائے ہیں۔ اُن کی اپنی پالیسی ترجیحات ہیں۔ وہ ڈرامائی طور پر اپنے سرکاری گھر یعنی امریکی ایوانِ صدر وائٹ ہاؤس کو نئی شکل دے رہے ہیں۔ انہوں نے عالمی تجارتی نظام کو بھی ہلا کر رکھ دیا ہے۔ اقوامِ متحدہ سے بیرونی امداد تک بین الاقوامی سفارت کاری کی مشینری کو امریکا کی طرف سے فنڈنگ میں کمی کے ہاتھوں شدید دھچکا لگا۔ ایک زمانے سے چلے آ رہے دفاعی اتحادوں کو نئی شکل دی گئی۔ اِس کے نتیجے میں امریکا کو عسکری اور معاشی بنیاد پر غیر معمولی فائدہ پہنچا۔ امریکی صدر نے ایک صدی سے بھی زائد مدت کے دوران ایگزیکٹو اختیارات کا شدید ترین اطلاق کیا۔ صدر ٹرمپ نے ڈیموکریٹس کے تحت چلائے جانے والے شہروں میں فوجی بھیجے اور جامعات کی فنڈنگ میں کٹوتی کر دی۔ امریکا کے قومی بینک فیڈرل ریزرو کی خود مختاری پر ضرب لگائی گئی۔ صدر کے دشمنوں کے خلاف سرکاری مشینری کو بلا دریغ استعمال کیا گیا۔

امریکی جمہوریت کے ستونوں پر ضربیں لگائی گئی ہیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا کہ جو کچھ ہو رہا ہے یا کیا جا رہا ہے، اُس کا حتمی اور فیصلہ کن نوعیت کا نتیجہ کیا ہوگا۔ محسوس ہوتا رہا ہے کہ معاملات کو اب باقاعدہ طریقے سے ہٹ کر جابرانہ انداز سے نپٹانے کی بنیاد ڈالی جا رہی ہے۔ ہم پہلے بھی متنبہ کرتے رہے ہیں کہ صدر ٹرمپ امریکا کے معاشی مفادات کو محفوظ رکھنے کے نام پر بہت کچھ الٹا سیدھا کر رہے ہیں۔ وہ خود مختار اداروں کو سیاسی بنا رہے ہیں۔ بدعنوانی کو فروغ دے رہے ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ صدر ٹرمپ خود کو کسی بھی قانون کا پابند سمجھنے کے لیے تیار نہیں۔

ایسا نہیں ہے کہ صدر ٹرمپ کو جابرانہ اندازِ حکمرانی سے کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ وہ اپنے مطلوب نتائج حاصل کرنے میں بہت حد تک کامیاب بھی رہے ہیں۔ غزہ میں سیز فائر کو بھی اُن کی کامیابیوں کے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے۔ یہ سب کچھ نیویارک کی رئیل اسٹیٹ ڈیل کے انداز سے کیا گیا۔ نیٹو اتحادیوں سے معاملات میں سختی برتنے کا نتیجہ دفاعی اخراجات میں اضافے کی صورت میں برآمد ہوا۔ صدر ٹرمپ نے چھوٹے ممالک کے بازو مروڑے، ڈرایا دھمکایا اور اپنے لیے نوبیل کے امن انعام کی راہ ہموار کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ انہوں نے چند ایک معاملات میں تصفیہ کرانے کا ڈراما کیا اور کسی نہ کسی طور، کاغذی سطح ہی پر سہی، معاہدے کروا کے اُن کا کریڈٹ لیا۔

چند ایک ناکامیاں بھی صدر ٹرمپ کے حصے میں آئیں۔ چین اور بھارت سمیت بہت سے ممالک کے خلاف تادیبی نوعیت کے ٹیرف عائد کر کے امریکی صدر نے چاہا کہ امریکی معیشت کے لیے پنپنے کی گنجائش پیدا کریں۔ بھارت کو بظاہر روس سے خام تیل خریدنے کی سزا دی گئی۔ برازیل کے خلاف ٹیرف کی نوعیت بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ امریکی اقدامات کے نتیجے میں بھارت اور برازیل چین کی طرف مزید جھکنے کو ترجیح دیں گے۔ چین کے خلاف بھی اقدامات کیے گئے مگر وہ مجموعی طور پر فاتح کی حیثیت سے ابھرا ہے۔

صد شکر کہ امریکی صدر کی طرف سے ٹیرف کے نام پر کیے گئے اقدامات سے عالمی معیشت بیٹھ نہیں گئی۔ تادیبی نوعیت کے ٹیرف کے نتیجے میں امریکا کی مجموعی قومی آمدنی میں کچھ خاص اضافہ نہیں ہوا۔ توقع بہت زیادہ کی تھی۔ اس کے جواب میں جو کچھ بھی کیا گیا وہ محدود نوعیت کا تھا اور ۱۹۳۰ء کے عشرے کے زمانے کی تجارتی جنگ کو بہت حد تک ٹالنے میں مدد ملی۔ بہت سے ملکوں نے امریکا سے تجارتی سودے ختم کر دیے اور اِس کے نتیجے میں انہیں ٹیرف سے کچھ خاص نقصان نہیں پہنچا۔ امریکا نے کرپٹو کرنسی کے میدان میں کامیابی کو زیادہ ترجیح دی۔ اِس کا اُسے فائدہ بھی پہنچا۔ دوسری طرف مصنوعی ذہانت کے شعبے میں غیر معمولی پیشرفت نے امریکا کو وقتی طور پر اچھا خاصا فائدہ پہنچایا جس کے نتیجے میں امریکا اپنی عالمگیر برتری کی عمر کو کچھ بڑھانے میں ضرور کامیاب ہوا۔ اس کے نتیجے میں امریکا سمیت بہت سے ملکوں میں اسٹاک مارکیٹ کچھ بلند ہوئی اور امریکی معیشت کے لیے کچھ پنپنے کی راہ ہموار ہوئی۔ بہت سے عالمی قائدین اِس صورتِ حال سے پریشان تھے مگر انہوں نے کھل کر کچھ کہنے سے صاف گریز کیا۔

اندرونی صفحات پر

- بھارت بنگلا دیش تعلقات کا مستقبل
- بھارت کو ہتھیار بیچنے میں وقت لگے گا!
- اسرائیلی جیل میں ۴۵ برس۔۔۔
- اسرائیل کا وجود ہی خدا سے بغاوت کا تسلسل
- وینزویلا پر ٹرمپ کی فوجی مہم جوئی
- ۲۰۲۶ء: پاکستان کو درپیش مسائل اور ممکنہ حل
- مصنوعی ذہانت: تیل کی طلب میں اضافہ؟
- اسرائیل کا 'صومالی لینڈ' کو تسلیم کرنے کا فیصلہ

Fortnightly "Maarif Feature" Karachi: REG.No.SC-1303

اب بہت کچھ داؤ پر لگا ہوا محسوس ہو رہا ہے۔ سب سے زیادہ خطرہ مغربی لبرل ڈیموکریسی کو لاحق ہے۔ امریکا میں جابرانہ اندازِ حکمرانی نے معاملات کو بہت خراب کیا ہے۔ یورپ میں غیر معمولی تشویش کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ یورپ کے بیشتر قائدین کو یہ تشویش لاحق ہے کہ کہیں یورپ کی حدود میں بھی آمرانہ طرزِ حکومت کی وکالت کرنے والے اٹھ کھڑے نہ ہوں۔ انتہائی دائیں بازو کا طبقہ اِس حوالے سے دردِ سر بنا ہوا ہے۔ امریکا میں وسط مدتی پارلیمانی انتخابات ہونے کو ہیں۔ اگر ڈیموکریٹس نے ایوانِ نمائندگان میں اپنی اکثریت یقینی بنانے میں کامیابی حاصل کی تو صدر ٹرمپ کو کسی حد تک کنٹرول کرنے میں مدد ملے گی۔ اس بات کا خدشہ بھی موجود ہے کہ ٹرمپ انتظامیہ امریکا کی انتخابی مشینری میں بھی مداخلت کر سکتی ہے۔ ڈیموکریٹس کی مقبولیت میں غیر معمولی کمی واقع ہو چکی ہے۔

امریکی خارجہ پالیسی کس طرف رواں ہے، اِس کے بارے میں واضح ترین اشارے ایشیا اور لاطینی امریکا سے ملیں گے۔ (لاطینی امریکا سے اشارے مل چکے ہیں۔ وینزویلا میں جو کچھ بھی امریکا نے کیا ہے، اُس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اب ڈونلڈ ٹرمپ باقی دنیا میں بھی کیا کرنا چاہتے ہیں۔ وہ اِس وقت کسی کے بھی پابند دکھائی نہیں دے رہے۔

امریکا کو دوبارہ عظیم بنانے کا جنون ڈونلڈ ٹرمپ کے سر پر یوں سوار ہے کہ وہ اپنی راہ میں آنے والی کسی بھی جائز رکاوٹ یا روک تھام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یورپ کے بیشتر ممالک میں بھی قوم پرستانہ جذبات نمایاں طور پر ابھرتے جا رہے ہیں۔ برطانیہ میں بھی نائجل فیریج کی ریفارم یو کے پارٹی رائے عامہ کے جائزوں میں غیر معمولی مقبولیت سے ہمکنار دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے میں مقامی حکومتوں کے انتخابی نتائج دیکھ کر ہی اندازہ ہو سکے گا کہ برطانیہ اب کس سمت رواں ہوگا۔ دوسری طرف یورپ کے بہت سے چھوٹے بڑے ممالک میں بھی سیاسی سطح پر نظریاتی اکھاڑ پچھاڑ جاری ہے۔ برطانیہ میں نائجل فیریج کے وزیرِ اعظم بننے کا امکان خاصا توانا ہے۔ فرانس میں حکومتیں کمزوری کا شکار رہی ہیں اور اِس وقت بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ ۲۰۲۶ء میں فرانس کو ایک بار پر حکومت کی تشکیل کے مرحلے سے گزرنا پڑے۔ جرمنی میں سخت گیر دائیں بازو کے عناصر کی متبادل حکومت کی راہ مسدود کرنے کے لیے کیے جانے والے اقدامات کمزور پڑتے دکھائی دے رہے ہیں۔

امریکا ایک بار پھر اپنے آپ کو منوانے پر تُلا ہوا ہے۔ پہلی بار اُسے اِس طور مان لیا گیا تھا کہ کہیں بہت زیادہ خرابی رونما نہیں ہوئی تھی۔ بیسویں صدی کے اوائل میں امریکا نے مرحلہ وار طاقت حاصل کی اور معاشی بنیادیں مضبوط کرنے کے لیے عسکری بنیادوں کو وسیع تر اور مضبوط تر کرنے کی سمت بڑھا۔ اب معاملہ کچھ اور ہے۔ امریکا ایک بار پھر چاہتا ہے کہ اُسے حقیقی سپر پاور تسلیم کیا جائے یعنی کسی اور ملک کو اُس کے مقابلے میں کچھ سمجھا ہی نہ جائے۔ چین ایک بڑی طاقت اور حقیقت بن کر سامنے کھڑا ہے۔ یورپ بھی جانتا ہے کہ چین، بھارت اور برازیل کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اور روس؟ وہ بھی تو سر پر کھڑا ہے۔ امریکی صدر کسی نہ کسی طور جنوبی امریکا کو مُٹھی میں رکھنے پر بھی بضد ہیں۔ دوسری طرف وہ دنیا بھر سے یہ منوانے پر بھی تُلے ہوئے ہیں کہ امن کی خواہش اگر واقعی کسی کی ہے تو وہ صرف امریکا ہے۔ وہ ساری دنیا سے منوانا چاہتے ہیں کہ دنیا کا واحد امن پسند ملک امریکا ہے۔

صدر ٹرمپ امن کا نوبیل انعام اِس لیے بھی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ اس صورت میں وہ مشرقِ وسطیٰ میں تادیر ملوث رہ سکیں گے۔ وہ اسرائیل کو غزہ میں ہمہ گیر نوعیت کی جنگ سے روک سکیں گے اور اِس کے عوض بنیامین نیتن یاہو کو معافی بھی دلوا سکیں گے۔ وہ چاہیں گے کہ اگر نیتن یاہو کے لیے ایوانِ اقتدار میں مزید رہنا ممکن نہ ہو تو بھی وہ عزت سے ضرور رخصت ہو۔

امریکا کو عالمی سطح پر اپنی برتری برقرار رکھنے اور اُس میں اضافے کے لیے انتہائی اہم نوعیت کی معدنیات کی بھی اشد ضرورت ہے۔ ایک طرف چین اور دوسری طرف روس سے شدید مسابقت کا سامنا ہے۔ جدید ترین الیکٹرانک آلات میں استعمال ہونے والی اہم معدنیات کے حصول کی دوڑ میں چین بہت آگے ہے۔ وہ طاقت استعمال نہیں کر رہا بلکہ تجارتی معاہدوں کے ذریعے سپلائی جاری رکھنا چاہتا ہے۔ دوسری طرف امریکی صدر یوکرین کے مستقبل کو یورپ کے حوالے کرنا چاہتے ہیں۔ یورپ کے لیے یوکرین کا مؤثر دفاع یقینی بنانا کسی بھی سطح پر کوئی آسان بات نہیں۔ روس کی لشکر کشی سے اب تک یورپ نے اس قضیے میں پڑنے سے بہت حد تک گریز کیا ہے اور روس سے واضح خطرہ محسوس کرتے ہوئے ایک طرف بیٹھ کر تماشا دیکھتے رہنے کو ترجیح دی ہے۔

ایشیا میں امریکا کو سب سے پہلے اور سب سے زیادہ تو چین سے نپٹنا ہے۔ امریکی معیشت کے لیے پیدا ہونے والی مشکلات کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ صدر ٹرمپ چاہیں گے کہ چین سے کوئی جامع تجارتی معاہدہ ہو جائے تاکہ تجارتی میدان میں زیادہ ہزیمت کی گنجائش نہ رہے۔

جنوبی امریکا میں امریکا کی حاشیہ بردار حکومتیں بھی ہیں۔ ارجنٹائن میں ہاویئر میلئی اور السلواڈر میں نیب بکیل کی حکومتیں امریکا نواز رہی ہیں۔ امریکا اِن کی بھرپور حمایت اور مدد جاری رکھنا چاہتا ہے۔ صدر ٹرمپ چاہتے ہیں کہ وینزویلا میں حکومت تبدیل کریں۔ کولمبیا میں بھی وہ کچھ ایسا ہی چاہتے ہیں۔ صدر ٹرمپ یہ دکھانا چاہتے ہیں کہ وہ غیر قانونی ترکِ وطن، جرائم اور منشیات کی روک تھام کے لیے سنجیدہ ہیں اور اِس معاملے میں جنوبی امریکا میں اُن کی طرف سے عسکری مہم جوئی سے امریکا کو بہت حد تک فائدہ پہنچ سکتا ہے۔

امریکی معیشت کو مشکلات کا سامنا ہے۔ مارکیٹ میں مندی ہے۔ صارف کے اعتماد کو ٹھیس لگ چکی ہے۔ امریکا میں کساد بازاری کی لہر آسکتی ہے۔ ایسے میں مصنوعی ذہانت کے حوالے سے امریکی مہارت اور برتری بھی ایک خاص حد تک ہی مدد کر پائے گی۔ ٹیرف کی پالیسی نے امریکی معیشت کو شدید نقصان پہنچایا ہے۔ اس نقصان کو پورا کرنے میں مصنوعی ذہانت کے شعبے کی برتری بھی ایک خاص حد تک ہی کوئی کردار ادا کر سکتی ہے۔ امریکی معیشت کو بجٹ کے بہت بڑے خسارے کا سامنا ہے۔ اس بوجھ کو راتوں رات اتارا نہیں جا سکتا۔ ایک بڑا مسئلہ یہ بھی ہے کہ صدر ٹرمپ فیڈرل ریزرو کا نیا چیئرمین ایسا چاہتے ہیں جو اس بات کو یقینی بنائے کہ یہ ادارہ اپنے طور پر کام نہ کرے بلکہ اپنے اختیارات ایوانِ صدر کے سامنے ڈھیر کر دے۔ دنیا بھر میں بڑے ممالک اپنی اپنی کرنسی کو زیادہ سے زیادہ مقبولیت سے ہمکنار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں تاہم فی الحال ڈالر کی برتری کے خاتمے کا کوئی امکان دکھائی نہیں دے رہا۔ ہاں، امریکی معیشت کی مشکلات ضرور برقرار رہیں گی۔

اگر امریکی معیشت سنبھل نہ سکی تو ڈیموکریٹس کے دوبارہ برسرِ اقتدار آنے کا امکان قوی ہو جائے گا۔ اگر ڈیموکریٹس پھر اقتدار میں آئے تو جمہوریت کی بقا کے حوالے سے چند ایک فیصلہ کن اقدامات ضرور کریں گے۔ سوال امریکی ایوانِ صدر کے اختیارات کو کنٹرول کرنے کا بھی ہے۔ اگر معیشت نہ سنبھل سکی تو ڈونلڈ ٹرمپ کو بھی اپنے معاملات پر نظر ثانی کی تحریک ملے گی۔

امریکا کے بانیان کو بھی بہت سے معاملات میں مایوسی کا سامنا تھا۔ سائراکیوز یونیورسٹی کے تاریخ دان ڈینس

رازموزین کا کہنا ہے کہ امریکا کے قیام کے بعد جارج واشنگٹن، جیفرسن اور ہیملٹن یہ دیکھنے کے لیے بے تاب تھے کہ امریکا ایک آزاد و خودمختار ملک کی حیثیت سے کامیاب ہو بھی سکے گا یا نہیں۔ انہوں نے امریکا کی بقا کے لیے ضروری سمجھے جانے والے اقدامات ضرور کیے تھے مگر پھر بھی بہت کچھ اُن کے کنٹرول میں نہ تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ بے لگام طاقت کی خرابیاں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ انہوں نے چند سیاسی آدرش پیش کیے تھے اور اُن کا خیال رکھنے کی بھرپور تاکید بھی کی تھی۔ امریکا ایک بہت بڑا تجربہ تھا۔ اُس پر حملے بھی ہو سکتے تھے۔ غلامی کے خاتمے کو مؤخر کر دیا گیا تھا۔ ڈیموکریٹک مملکتوں کا ریکارڈ بھی تب تک شاندار نہیں تھا۔

ایسا نہیں ہے کہ امریکا کی بقا کے حوالے سے خدشات نئے ہیں۔ ڈیڑھ سو سال قبل بھی ایسے ہی خدشات پیش کیے جاتے رہے تھے۔ امریکا کے اعلانِ آزادی میں صدر ولیم جیفرسن نے انگلینڈ کے شاہ جارج سوم پر فوجی امریکی سرزمین پر بھیجنے کا الزام بھی عائد کیا تھا۔ صدر ڈونلڈ ٹرمپ کا معاملہ یہ ہے کہ وہ خود ہی اپنے دشمنوں کا تعین کر کے اُنہیں سزا دینے کا اختیار چاہتے ہیں۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ امریکا میں ۲۰۲۶ء کے دوران ایک ایسی چارج شیٹ سامنے آئے جس میں یہ الزام عائد کیا گیا ہو کہ صدر ٹرمپ اپنے دفتر اور منصب اپنے ذاتی (کاروباری) مفادات کی تکمیل کے لیے استعمال کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں۔ اور یہ بھی کہ انہوں نے ایک اور مدت کے لیے صدر منتخب ہونے کی خاطر آئین پر حملوں کی دھمکی دینے سے بھی اجتناب نہیں برتا۔

۱۷۷۵ء میں بانیانِ امریکا کو کچھ بھی اندازہ نہ تھا کہ جو نیا ملک وہ قائم کرنے والے ہیں، وہ انتہائی طاقتور ہو کر بہت کچھ کرے گا۔ غلامی کی روایت ختم کرنے کے درپے ہوگا۔ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا ہوگا کہ کبھی اُن کا ملک انتہائی نوعیت کی طاقت کا حامل ہونے کے بعد اِس قدر بیزار ہو چکا ہوگا کہ اپنی باگ ڈور ایک ایسے بزنس مین کے حوالے کر دے گا جو ایک ریئلٹی شو کا میزبان رہ چکا ہوگا۔ امریکا نے اپنی باگ ڈور ٹرمپ کو ایک بار نہیں، دو بار سونپی ہے۔

امریکا کے بانیان نے یہ خدشہ کھل کر ظاہر کیا تھا کہ ملک کی حدود ہی میں ایسے سیاسی عناصر پنپ سکتے ہیں جو انتہائی آمرانہ و جابرانہ طرزِ حکومت کے حامل ہوں۔ انہیں یہ خدشہ بھی لاحق تھا کہ امریکا پر کوئی بہت بڑا حملہ بھی ہو سکتا ہے اور پورے ملک کا نظام درہم برہم بھی ہو سکتا ہے۔ اِس کا ایک حل یہ تھا کہ صدر کو غیر معمولی اختیارات نہ سونپے جائیں۔ بانیانِ امریکا ہنگامی حالت سے بہت دور رہنے کا انتظام کرنا چاہتے تھے مگر ڈونلڈ ٹرمپ نے ایک ایک دن ہنگامی حالت کے تحت حکومت کی ہے۔ عدالتی احکام کی تعمیل میں بھی تضاد کا پہلو بہت نمایاں ہے۔ کوئی عدالت کہتی ہے کہ امریکی صدر کسی ایک ریاست کے نیشنل گارڈز کو کسی دوسری ریاست میں تعینات نہیں کر سکتے۔ پھر ایک اور رولنگ کہتی ہے کہ تارکینِ وطن کی آمد روکنے سے متعلق اقدامات روکے جائیں کیونکہ یہ تاثر مل رہا ہے کہ تارکینِ وطن کو روکنے کے لیے معاملے میں امریکی صدر امیگریشن اینڈ کسٹمز انفورسمنٹ کو اپنی ذاتی ملیشیا کے طور پر استعمال کر رہے ہیں۔ امریکی ایوانِ صدارت کے اقدامات استعماری نوعیت کے معلوم ہوتے ہیں۔

تارکینِ وطن کے معاملے میں صدر ٹرمپ کا رویہ بہت غیر لچکدار رہا ہے جس کے نتیجے میں خاصا بگاڑ پیدا ہوا ہے۔ اب معاملہ یہ ہے کہ وہ خود ہنرمند تارکینِ وطن کو امریکا لانے کے حق میں ہیں۔ اس معاملے میں کھیتوں میں کام کرنے کے لیے موسمی نوعیت کے ویزا جاری کرنے پر بھی غور ہو رہا ہے۔ ڈیموکریٹس کا اعتراض یہ ہے کہ تارکینِ وطن کے معاملے میں صدر ٹرمپ نے اپنی ہی پالیسی کو ختم کر دیا ہے۔ امریکا کو دوبارہ عظمت سے ہمکنار کرنے کا ایک راستہ ٹرمپ کو یہ دکھائی دے رہا ہے کہ غیر قانونی تارکینِ وطن کی راہ مسدود کر کے زیادہ سے زیادہ مقامی امریکیوں کو کام کرنے کا موقع فراہم کیا جائے۔ اس معاملے میں ری پبلکنز کے ساتھ ساتھ چند ایک ڈیموکریٹ ریاستیں بھی ٹرمپ کی حمایت کر رہی ہیں۔ اس حوالے سے بل منظور کر لیے جانے پر ڈپٹی چیف آف اسٹاف اسٹیفن ملر بہت اداس ہیں۔

مصنوعی ذہانت کی گرم بازاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ٹرمپ انتظامیہ مالیاتی قواعد و ضوابط کو کم کرتے ہوئے توانائی کے نئے منصوبوں اور ٹرانسمیشن لائنز کے لیے اجازت نامے جاری کر رہی ہے۔ سولر انرجی کے علاوہ وِنڈ پاور منصوبوں میں بھی سرمایہ کاری بڑھ رہی ہے۔ اِس کے نتیجے میں امریکا میں روزگار کا منظر نامہ بگڑنے سے بچ گیا ہے۔ وائٹ کالر جابز کا زوال کچھ دیر کے لیے ٹل گیا ہے۔ ٹیرف طے اور نافذ کرنے کے چند معاملات کانگریس کے حوالے کر دیے گئے ہیں۔

امریکی سیاسی تاریخ بہت سے عجیب واقعات سے بھری پڑی ہے۔ اگر ہم مان لیں کہ ۲۰۲۶ء کے دوران صدر ٹرمپ اپنے بیشتر معاملات میں کامیاب رہیں گے، تب بھی ہمیں ایسا بہت کچھ دکھائی دے سکتا ہے جس کی توقع ہم نے نہ کی ہو۔

یورپ میں ۲۰۲۶ء اسلحہ، معاشی نمو اور سبزے پر مدار کا حامل ہے۔ یورپ پر غیر معمولی دباؤ ہے۔ اُسے یوکرین پر روس کی لشکر کشی کے پیش منظر میں دفاعی تیاریوں پر بہت زیادہ خرچ کرنا ہے اور توجہ بھی بہت زیادہ دینی ہے۔ امریکا نے اپنے آپ کو یوکرین کے دفاع کی ذمہ داری سے بہت حد تک الگ کر لیا ہے۔ یورپ میں روسی عزائم کے حوالے سے شدید نوعیت کے تحفظات پائے جاتے ہیں۔ خاصی طویل مدت سے یورپ معاشی معاملات میں کمزور رہا ہے۔ اب اُسے بحالی کی طرف جانا ہی پڑے گا۔ ناخوش ووٹرز سیاسی انتہاؤں کی طرف جا سکتے ہیں۔ اُنھیں ایسا کرنے سے روکنے کے لیے یورپ کے سیاسی قائدین کو ایسا کچھ کرنا پڑے گا کہ انتہائی دائیں بازو کے عناصر اقتدار کے ایوانوں تک نہ پہنچ سکیں۔ اگر کسی بڑی یورپی ریاست میں کوئی ایک بھی انتہا پسند برسرِ اقتدار آ گیا تو پورا براعظم جنگ کے شعلوں میں جھلس مرے گا۔

۲۰۲۲ء میں یوکرین پر روس کی لشکر کشی سے اب تک یورپ کے لیے چیلنج بڑھتے ہی رہے ہیں۔ روس نے بہت سے معاملات میں یورپ کے سیاسی، کاروباری اور دفاعی معاملات کو سبوتاژ کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے تاکہ دباؤ بڑھایا جا سکے۔ روسی ڈرون پولینڈ اور رومانیہ میں بھی داخل ہوئے ہیں۔ روسی لڑاکا طیارے نیٹو کی ایئر اسپیس میں بھی بھٹکتے پائے گئے ہیں۔

یورپ کے لیے اس وقت سب سے بڑا مسئلہ غیر معمولی دفاعی تیاریوں کا ہے اور اِس کے لیے طے کیا گیا ہے کہ ہر یورپی ملک دفاع کی مد میں اپنی خام قومی پیداوار (جی ڈی پی) کا کم از کم ساڑھے تین فیصد مختص کرے۔ پولینڈ، لتھوانیا اور لیٹویا کے سوا بیشتر یورپی ریاستوں نے اب تک اپنے ووٹرز کے سامنے دفاعی اخراجات کی صراحت پیش کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہے۔ اسپین کہہ چکا ہے کہ اُس کے لیے دفاعی بجٹ کا نیا ہدف پورا کرنا کسی بھی طور ممکن نہیں۔

دفاع کے حوالے سے یورپی ریاستوں کے درمیان غیر معمولی نوعیت کے اختلافات اور تنازعات پائے جاتے ہیں۔ یورپی معیشتیں بھی شدید دباؤ میں ہیں۔ معاشی نمو کی رفتار ہدف سے کہیں کم ہے اور بے روزگاری کا خطرہ بھی سروں پر منڈلا رہا ہے۔ مجموعی پیداوار میں پریشان کن حد تک کمی واقع ہو رہی ہے۔ معاشی نمو کی شرح کو برقرار رکھنا بھی انتہائی دشوار ثابت ہو رہا ہے۔ یورپ میں افرادی قوت کا

مسئلہ سب سے زیادہ پریشان کن ہے۔ معمر افراد کی تعداد بڑھ رہی ہے۔ تارکینِ وطن کو قبول کرنے کا رجحان کمزور ہے۔ ایسے میں ملازمتیں امریکا اور ایشیا منتقل ہو رہی ہیں۔ ساتھ ہی ساتھ مالیات کا رُخ بھی اِن خطّوں کی طرف ہے۔

یورپ کو کووِڈ کے دور میں معاشی اعتبار سے جو ضرب لگی تھی، وہ اب تک اُس سے بھی پوری طرح بحال نہیں ہوسکا ہے۔ کمزور حکومتیں یورپ کا مقدر ہو کر رہ گئی ہیں۔ پالیسیوں میں پائیداری نہیں۔ اِس کے نتیجے میں معیشتیں بھی بحالی کی طرف مائل نہیں ہو پا رہیں۔ بہبودِ عامہ کی فنڈنگ میں کمی واقع ہو رہی ہے۔ بیشتر یورپی ریاستوں میں کمزور حکومتوں کو نئے انتخابات کے خطرے کا سامنا ہے۔ ان میں فرانس بھی شامل ہے۔

ماحول سے متعلق پالیسی میں بھی یورپ اور امریکا کی سوچ میں بہت فرق ہے۔ یورپ چاہتا ہے کہ اُس کا پورا ماحول ہی گرین یعنی ماحول دوست ہو جائے۔ اس مقصد کا حصول یقینی بنانے کے لیے تمام ہی معاملات میں بنیادی تبدیلیاں لائی جارہی ہیں۔ اس کے نتیجے میں بہت سے شعبے غیر متوازن بھی ہو چکے ہیں۔ توانائی کے معاملے میں گرین پالیسی کو اپنانے سے بہت کچھ بدلنا پڑ گیا ہے۔ یورپ ۲۰۳۵ء تک پیٹرول اور ڈیزل سے چلنے والی تمام گاڑیوں سے نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اب تک تو یورپ بحرانوں سے فوائد بٹورتا آیا ہے۔ کووِڈ کی وبا نے یورپی ریاستوں کو مشترکہ ادھار کی طرف روانہ کیا۔ یوکرین کی جنگ نے یورپ کو دفاع کے لیے متحد ہونے کا پیغام دیا۔ ۲۰۲۶ء میں ایسا کچھ ہوتا دکھائی نہیں دے رہا۔

ایک بڑا امکان یہ ہے کہ چین اب دفاعی پالیسیاں ترک کرکے جارحیت کی طرف مائل ہوگا۔ اب تک چین نے ایک طرف کھڑے ہو کر تماشا دیکھنے کو ترجیح دی ہے مگر اب ایسا لگتا ہے کہ وہ بھی ذرا کھل کر سامنے آنے کے لیے بے تاب ہے۔ تائیوان کے معاملے میں وہ طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا ہے۔ خطے میں چند دوسرے ممالک بھی چین کی طرف مہم جوئی کا خطرہ محسوس کر رہے ہیں۔ امریکا نے چین کو مختلف معاملات میں نیچا دکھانے کی جتنی بھی کوششیں کی ہیں، اُن میں سے بیشتر اب تک مکمل ناکام رہی ہیں۔ تجارت کے میدان میں چین نے امریکا کو پچھاڑ ہی دیا ہے۔ اب ہائی ٹیک میں بھی چین بہت آگے چل رہا ہے۔ صدر ٹرمپ نے چین کے خلاف جارحانہ پالیسیاں اپنائی ہیں مگر اِس کا کچھ خاص فائدہ نہیں پہنچا۔ اب چین چاہتا ہے کہ بین الاقوامی معاملات میں اُس کی رائے کو بھی مقدم رکھا جائے۔ اب تک تو سب کچھ امریکا اور یورپ کی مرضی سے طے ہوتا آیا ہے مگر چینی قیادت اِس سلسلے کو مزید چلنے نہیں دینا چاہتی اور اِس بات پر زور دے رہی ہے کہ عالمی نظام کو چلانے میں چین کو بھی کلیدی کردار دیا جائے۔

چین اب ڈالر کی برتری کو ختم کرنے کے بھی درپے ہے۔ ۲۰۲۶ء میں اس حوالے سے زیادہ جارحانہ اقدامات کا امکان ہے۔ چپ میکنگ اور مصنوعی ذہانت میں بھی چین نے اپنی برتری منوالی ہے۔ چین نے دنیا بھر سے خریدا ہوا ایک ارب بیس کروڑ بیرل تیل بھی ذخیرہ کر رکھا ہے۔ چینی معیشت کو چلتا رکھنے کے لیے توانائی کی بہت بڑے پیمانے پر ضرورت پڑتی ہے۔ غیر روایتی ذرائع پر بھی انحصار بڑھ رہا ہے۔ توانائی اور معدنیات کے معاملے میں چین بہت زیادہ حساس اور متوجہ ہے۔ جدید معیشت کے لیے ناگزیر سمجھی جانے والی معدنیات کی سپلائی جاری رکھنے کے لیے چین نے ایشیا اور افریقا میں بہت بڑے پیمانے پر سرمایہ کاری کر رکھی ہے۔ چین کل تک مینوفیکچرنگ کے شعبے کا حکمران تھا۔ اب وہ جدید ترین ٹیکنالوجیز اور مالیات میں بھی آگے بڑھ رہا ہے۔ ٹیرف سے بچنے کے لیے اب چین اپنی صنعتی پیداوار کی برآمد کو کنٹرول کر رہا ہے۔

۲۰۲۶ء میں مشرقِ وسطیٰ کے لیے معاملات ملے جلے رہیں گے۔ نہ تو بھرپور ترقی ہوگی نہ مکمل تباہی۔ دو سال سے مشرقِ وسطیٰ میں معاملات تذبذب اور ٹھہراؤ کا شکار رہے ہیں۔ ۲۰۲۶ء میں بھی کچھ ایسا ہوگا تاہم تھوڑی سی بہتری اِس لیے آئے گی کہ غزہ میں لڑائی رک چکی ہے۔ دنیا کے پاس ایک اچھا موقع ہے کہ مشرقِ وسطیٰ کو مستحکم کرنے کی سمت بڑھے۔ غزہ میں تعمیرِ نو سے یہ عمل شروع کیا جاسکتا ہے۔ اب بین الاقوامی امن فوج غزہ کے معاملات سنبھالے تو کچھ ہوسکتا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ ایران میں بھی تبدیلیوں کی لہر سی اٹھتی دکھائی دے رہی ہے۔ اگر ایران میں قیادت تبدیل ہوئی تو ایران کو دورِ جدید کے سانچے میں ڈھالنے کا عمل شروع ہوسکتا ہے۔ سیاسی قیدیوں کی رہائی لازم ہے۔ ایران کو اپنی ساکھ بھی بہتر بنانی ہے۔ (مترجم: ابوصباحت)

"The contours of 21st-century geopolitics will become clearer in 2026". ("The Economist". November 10, 2025)

بقیہ: وینزویلا پر ٹرمپ کی فوجی مہم جوئی

صدر ٹرمپ کے حملوں کے خلاف دوسرا مضبوط نکتہ یہ ہے کہ یہ حملے بین الاقوامی قانون کی بھی خلاف ورزی ہیں۔ جن کشتیوں کو منشیات اسمگلنگ کے شبے میں نشانہ بنایا گیا، ان میں موجود افراد کو بغیر کسی عدالتی عمل کے قتل کر دیا گیا۔ ۱۹۴۹ء کے جنیوا کنونشنز اور اس کے بعد ہونے والے تمام بڑے انسانی حقوق کے معاہدے ایسے ماورائے عدالت قتل کی ممانعت کرتے ہیں اور امریکی قانون بھی یہی کہتا ہے۔

بظاہر امریکی انتظامیہ نے ایسے افراد کو ہلاک کیا جو اپنا دفاع نہیں کر سکتے تھے۔ ایک حملے میں بحریہ نے پہلی کارروائی کے تقریباً ۴۰ منٹ بعد ایک تباہ شدہ کشتی پر دوبارہ حملہ کیا جس میں دو ملاح مارے گئے جو ملبے سے چمٹے ہوئے تھے اور کوئی خطرہ ظاہر نہیں کر رہے تھے۔ ہمارے ساتھی اور سابق فوجی وکیل ڈیوڈ فرنچ کے بقول ''جنگ اور قتل کے درمیان فرق قانون ہی پیدا کرتا ہے۔''

اگرچہ قانونی دلائل سب سے اہم ہیں، مگر ایک حقیقت پسندانہ دلیل بھی موجود ہے۔ یہ اقدامات امریکا کے قومی مفاد میں نہیں۔ سب سے قریبی مثال ۳۶ سال قبل پاناما پر امریکی حملہ ہے، جس نے آمر مانوئل نوریگا کو ہٹا کر ملک کو جمہوریت کی راہ پر ڈالا۔ لیکن وینزویلا کئی حوالوں سے مختلف ہے۔ وہ ایک بڑا ملک ہے اور وہاں امریکا کی دہائیوں پر محیط موجودگی بھی نہیں رہی۔

وینزویلا میں افراتفری کا امکان کہیں زیادہ ہے۔ وہ جرنیل جنہوں نے مادورو کے نظام کو سہارا دیا، اچانک غائب نہیں ہو جائیں گے۔ نہ ہی وہ اقتدار ماریہ کورینا ماچادو کے حوالے کرنے کا امکان رکھتے ہیں جن کی تحریک نے حالیہ انتخابات میں کامیابی حاصل کی اور جنہوں نے گزشتہ ماہ نوبیل امن انعام قبول کیا۔

ممکنہ منفی نتائج میں کولمبیا کی بائیں بازو کی مسلح تنظیم ELN کی جانب سے تشدد میں اضافہ، یا مادورو دور میں سرگرم نیم فوجی گروہوں ''کولیکتیو'' کی بغاوت شامل ہوسکتی ہے۔ وینزویلا میں مزید بدامنی عالمی توانائی اور خوراک کی منڈیوں کو متاثر کرسکتی ہے اور پورے نصف کرّے میں مزید ہجرت کو جنم دے سکتی ہے۔

تو پھر امریکا کو وینزویلا کے مسئلے سے کیسے نمٹنا چاہیے؟ ہم وینزویلا کے شہریوں کی امیدوں کو سمجھتے ہیں، جن میں سے بعض مداخلت کے حامی ہیں لیکن کوئی آسان حل موجود نہیں۔ اب تک دنیا کو اقتدار کی تبدیلی کے خطرات کا ادراک ہو جانا چاہیے۔

ہم امید رکھتے ہیں کہ موجودہ بحران ہمارے خدشات سے کم نقصاندہ ثابت ہو، لیکن ہمیں اندیشہ ہے کہ صدر ٹرمپ کی اس مہم جوئی کا نتیجہ وینزویلا کے عوام کے لیے مزید تکالیف، خطے میں بڑھتے عدم استحکام اور عالمی سطح پر امریکا کے مفادات کو طویل مدتی نقصان کی صورت میں نکلے گا اور سب سے بڑھ کر، یہ ایک ناقابلِ تردید حقیقت ہے کہ صدر ٹرمپ کی یہ جنگ پسندی قانون کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ (مترجم: ابنِ فاروق)

"Trump's attack on Venezuela is illegal and unwise." ("NY Times". Jan 3, 2026)

بھارت بنگلادیش تعلقات کا مستقبل

Yashraj Sharma

بنگلا دیش میں تبدیلیوں کی لہر جاری ہے۔ بہت کچھ بدل رہا ہے۔ دو سال قبل بنگلا دیش میں انتخابات کے بعد عوامی لیگ کے اقتدار کو تسلسل ملنے کے بعد طلبا نے شاندار تحریک چلا کر شیخ حسینہ واجد اور اُن کے ٹولے کو اقتدار کے ایوانوں سے باہر کیا اور اِس کے بعد وہاں غیرجانبدار عبوری حکومت قائم ہوئی۔ اِس حکومت کے تحت بنگلا دیش کئی تبدیلیوں کے مراحل سے گزرا ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ واقع ہوئی ہے کہ بنگلا دیش اب بھارت سے دُور ہوچکا ہے اور پاکستان سمیت متعدد اسلامی و غیراسلامی ملکوں سے اُس کے تعلقات میں خاصی بہتری آئی ہے۔ اب بنگلا دیش میں انتخابات ہونے کو ہیں۔ اب کی بار بنگلا دیش نیشنلسٹ پارٹی (بی این پی) اور جماعتِ اسلامی کی پوزیشن خاصی مضبوط دکھائی دے رہی ہے۔ ایسے میں بنگلا دیش مستقبل قریب میں فیصلہ کُن انداز سے کون سی راہ پر گامزن ہوگا، یہ دیکھنے کے لیے ایک دنیا بے تاب ہے۔ بھارت بھی اپنے طور پر ایسا بہت کچھ کر رہا ہے جس کے نتیجے میں بنگلا دیش کو دوبارہ اپنا بغل بچہ بنانے میں کامیابی حاصل ہو۔

بھارت کے وزیرِ خارجہ ایس جے شنکر نے بنگلا دیش کی سابق وزیراعظم بیگم خالدہ ضیا مرحومہ کے بیٹے طارق رحمٰن سے ملاقات کی ہے۔ خطّے کی سیاست کے حوالے سے اِس ملاقات کو غیرمعمولی اہمیت دی جارہی ہے۔ تجزیہ کار اور تجزیہ نگار یہ دیکھنے کے لیے بے تاب ہیں کہ اب بنگلا دیش کس راہ پر گامزن ہوتا ہے۔

بیگم خالدہ ضیا کا انتقال ۳۰ دسمبر ۲۰۲۵ء کو ہوا۔ اُن کی تدفین میں شرکت کے لیے علاقائی ملکوں کے سیاسی قائدین نے نمایاں طور پر شرکت کی۔ بھارت کے وزیرِ خارجہ ایس جے شنکر نے ڈھاکا میں تدفین سے متعلق تقریبات کے موقع پر طارق رحمٰن سے ملاقات کی جنہوں نے اپنی والدہ کے دنیا سے چلے جانے کے بعد بی این پی کی قیادت سنبھالی ہے۔ ایس جے شنکر نے طارق رحمٰن کو بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی کا خط بھی دیا۔ بعدازاں اُنہوں نے طارق رحمٰن سے ملاقات کی تصویریں اپنے ایکس اکاؤنٹ پر شیئر کرتے ہوئے لکھا کہ اُنہوں نے بھارت کی حکومت اور عوام کی طرف سے طارق رحمٰن سے اظہارِ تعزیت کیا اور اِس امید کا اظہار کیا کہ بیگم خالدہ ضیا کی بصیرت اور اقدار بھارت اور بنگلا دیش کی پارٹنرشپ کو دن بہ دن توانا تر بنانے میں کلیدی کردار ادا کریں گی۔

یاد رہے کہ بھارت بہت سے مواقع پر، کبھی کُھل کر اور کبھی پوشیدہ طور پر، خالدہ ضیا کی ''بصیرت اور اقدار'' کی مخالفت کرتا رہا ہے۔

بیگم خالدہ ضیا کی زندگی بھرپور سیاسی جدوجہد سے عبارت تھی۔ اُنہوں نے ۱۹۸۰ء کی دہائی میں فوجی اقتدار کے خلاف بھرپور تحریک چلائی اور اِس کے نتیجے میں اُنہیں ۱۹۹۱ء میں پہلی بار اقتدار میں آنے کا موقع ملا۔ بیگم خالدہ ضیا کا اقتدار میں آنا بھارت کے لیے خاصی بدمزگی کا باعث ثابت ہوا۔ بھارتی قیادت نے اُنہیں شک کی نگاہ سے دیکھا۔ نئی دہلی کے سرکاری حلقوں کو اس بات کا یقین تھا کہ بیگم خالدہ ضیا کو اپنی مرضی کے مطابق چلانا ممکن نہ ہوگا۔ اِس کا ایک بنیادی سبب یہ تھا کہ بی این پی ایک طویل مدت تک بنگلا دیش کی سب سے بڑی اسلامی تنظیم جماعتِ اسلامی سے غیرمعمولی دوستانہ تعلق کی حامل رہی تھی۔ بنگلا دیش جماعتِ اسلامی پاکستان سے بہتر تعلقات کی خواہش مند اور اِس کے لیے کوشاں رہی ہے۔ بھارتی قیادت کو بیگم خالدہ ضیا کا اقتدار قبول نہ تھا اور اُنہیں وہ شک کی نظر ہی سے دیکھتی رہی تاہم عوامی لیگ کی سربراہ شیخ حسینہ واجد کا اقتدار بھارت کے لیے ہمیشہ قابلِ قبول رہا۔ عوامی لیگ بھارت نواز بھی تھی اور سیکولر بھی۔ سیکولرازم کے ساتھ ساتھ عوامی لیگ کا پاکستان سے دوری اختیار کرنا بھی بھارتی قیادت کے لیے بہت پسندیدہ معاملہ تھا۔

بنگلا دیش میں فروری میں انتخابات ہونے والے ہیں۔ ایسے میں ایس جے شنکر کے ریمارکس سے اندازہ ہوتا ہے کہ بھارت کو اِس بات کا یقین ہے کہ بنگلا دیش میں قائم ہونے والی نئی حکومت سے اُس کے تعلقات بہتر ہوں گے۔ بنگلا دیش میں ایک سال سے زائد مدت میں جو کچھ ہوا ہے، اُس کے پیشِ نظر بھارتی قیادت کا پریشان ہوا اُٹھنا فطری امر ہے اور وہ چاہتی ہے کہ معاملات کو سلجھایا جائے تاکہ بنگلا دیش کا جھکاؤ بھارت ہی کی طرف رہے۔

اُمورِ خارجہ میں طارق رحمٰن کے مشیر نے 'الجزیرہ' کو بتایا کہ طارق رحمٰن اور اُن کی ٹیم سے بھارتی وزیرِ خارجہ کی خوشگوار ماحول میں ہونے والی ملاقات اِس بات کی غماز ہے کہ دوطرفہ تعلقات میں ایک نئے مرحلے کے آغاز کی خاصی توانا امید پائی جاتی ہے۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش کی سوچ میں تبدیلی آئی ہے۔ ایسے میں بھارت بھی بہت کچھ سوچنے پر مجبور ہوا ہے اور دوسری طرف بی این پی کی قیادت سنبھالنے کے بعد طارق رحمٰن پر بھی بھارت سے تعلقات بہتر بنانے کے حوالے سے غیرمعمولی دباؤ ہے۔ حالات غیرمعمولی تبدیلیوں کے متقاضی ہیں اور اِس حوالے سے بھارت بھی بہت کچھ کرنے کے مُوڈ میں ہے اور اِدھر بی این پی کی قیادت بھی دوطرفہ تعلقات کے ایک دَور کی ابتدا یقینی بنانے کے حوالے سے محض پُرامید ہی نہیں بلکہ تیار بھی ہے۔

ایک نیا آغاز؟

جولائی ۲۰۲۴ء میں چلائی جانے والی شاندار طلبہ تحریک نے عوامی لیگ کی سربراہ شیخ حسینہ واجد کے پندرہ سالہ اقتدار کی بنیادیں ہلادیں تب اُنہیں بھاگ کر بھارت میں پناہ لینا پڑی۔ بھارت نے شیخ حسینہ واجد کو پناہ دے کر بنگلا دیشی عوام کی ناراضی مول لی ہے۔ شیخ حسینہ واجد سے بھارتی قیادت نے جس غیرمعمولی یکجہتی کا اظہار کیا ہے، اُس نے بنگلا دیش کے طول و عرض میں بھارت مخالف جذبات کو انتہائی بلندی پر پہنچادیا ہے۔ بنگلا دیشی عوام ایک زمانے سے اِس بات کے شاکی رہے ہیں کہ بھارت نے اُن کے ملک کے معاملات میں مداخلت کرکے بہت خرابیاں پیدا کی ہیں۔ شیخ حسینہ واجد کے عہدِ اقتدار میں بنگلا دیش کی پالیسیوں میں واضح طور پر بھارت کی طرف جھکاؤ رہا۔ اِس کے نتیجے میں بنگلا دیش کے لیے کُھل کر اور غیرجانبداری سے کام کرنا کبھی آسان نہیں رہا۔ شیخ حسینہ واجد اِس وقت بھارت میں ہیں۔ بنگلا دیش کی عدلیہ اُنہیں موت کی سزا سُنا چکی ہے۔ بھارت اُنہیں بنگلا دیشی اسٹیبلشمنٹ کے حوالے کرنے پر آمادہ نہیں۔ شیخ حسینہ واجد پر ۲۰۲۴ء میں حکومت مخالف مظاہرین کو سختی سے کچلنے کے احکام جاری کرنے کا الزام ہے۔ اِس کے نتیجے میں سیکڑوں ہلاکتیں واقع ہوئیں۔ اقوامِ متحدہ نے اپنی رپورٹس میں بتایا ہے کہ شیخ حسینہ واجد کے اقتدار کے آخری دنوں میں حکومت کے مخالفین کے خلاف کریک ڈاؤن کے دوران ۱۴۰۰ سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے۔

۲۰۲۴ء کی طلبہ تحریک کے ایک رہنما کی ہلاکت نے

معاملات کو مزید بگاڑ دیا ہے۔ یہ رہنما بھارت کا شدید مخالف تھا۔ اِس ہلاکت کے بعد سے بنگلا دیش بھر میں بھارت مخالف مظاہروں نے خاصا زور پکڑا ہے۔ بعض مقامات پر انتہائی پُرتشدد واقعات بھی رونما ہوئے ہیں۔ اِس کے بعد دونوں ممالک نے ویزا کا اجرا عارضی طور پر روک دیا ہے۔

یہ امر بھی خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ عوامی لیگ کو فروری کے عام انتخابات میں حصہ لینے سے روک دیا گیا ہے۔ بہت سے تجزیہ کاروں اور تجزیہ نگاروں کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش نیشنلسٹ پارٹی اُس خلا کو اپنے وجود سے پُر کرنا چاہتی ہے جو عوامی لیگ کے منظر سے ہٹنے کی صورت میں پیدا ہوا ہے۔ بی این پی اور جماعتِ اسلامی کے تعلقات بہت اچھے تھے مگر جب جماعتِ اسلامی نے ۲۰۲۴ء کی طلبہ تحریک کے قائدین کی قائم کردہ سیاسی جماعت سے اتحاد کیا تو بی این پی نے اُس سے دوری اختیار کرلی۔ فروری کے انتخابات میں لوگوں کی نظریں بی این پی اور جماعتِ اسلامی کی سربراہی میں قائم سیاسی اتحاد پر جمی ہیں۔

بھارت سے یہ بات بالکل ہضم نہیں ہوتی کہ پاکستان کی طرف واضح جھکاؤ رکھنے والی بنگلا دیش جماعتِ اسلامی انتخابات میں محض حصہ نہ لے بلکہ قابلِ ذکر کامیابی بھی حاصل کرے۔ دوسری طرف طارق رحمٰن نے حال ہی میں چند ایسے بیانات جاری کیے ہیں جو بھارت کے لیے خوش آئند نوعیت کے ہیں۔ ۱۷ سالہ جلا وطنی کے بعد وطن واپسی پر طارق رحمٰن نے کہا تھا کہ وہ ایک ایسا بنگلا دیش دیکھنا چاہتے ہیں جس میں سبھی کے لیے بہترین زندگی اور بہترین مواقع ہوں اور اقلیتوں کو خصوصی طور پر تحفظ حاصل ہو۔ بھارت کے سابق سیکرٹری خارجہ اور بنگلا دیش میں بھارت کے سابق ہائی کمشنر ہرش وردھن شرِنگلا کا کہنا ہے کہ اب یہ بات بلاخوفِ تردید کہی جاسکتی ہے کہ طویل جلا وطنی نے طارق رحمٰن کو بہت کچھ سکھا دیا ہے اور وہ اچھی طرح سمجھ گئے ہیں کہ علاقائی سطح پر حقیقی استحکام پیدا کرنے کے لیے کیا کرنا ہوگا۔

باہمی بے اعتمادی اور مخاصمت

۲۰۰۶ء میں اقتدار سے محرومی کے بعد سے اب تک بی این پی کی قیادت کو جلا وطنی ہی کا سامنا رہا ہے۔ پہلے فوج کی حمایت سے قائم حکومت نے بی این پی کے قائدین اور کارکنوں کو انتقام کا نشانہ بنایا اور اُس کے بعد عوامی لیگ کی حکومت نے بھی اُن کا ناطقہ بند کیا۔ بی این پی کو بے بنیاد مقدمات کا سامنا رہا ہے۔ اِس کے نتیجے میں اُنہیں سزاؤں کا سامنا بھی رہا ہے اور جلا وطنی کا عذاب بھی جھیلنا پڑا ہے۔ عوامی لیگ کے جبر و استبداد کا سامنا کرتے ہوئے بی این پی کے قائدین اور کارکنوں کو قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑی ہیں۔

بی این پی کو اب تک کے آخری دورِ اقتدار میں بھارت میں بھارتیہ جنتا پارٹی کی حکومت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ تب وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی تھے۔ بی جے پی کے اقتدار والے بھارت اور بی این پی کے اقتدار بنگلا دیش کے درمیان مناقشوں کا تعلق تجارت، سرحد، دریائی پانی کی تقسیم، نقل مکانی، مسلح بغاوت اور اقلیتوں کے خلاف تشدد سے تھا۔ نئی دہلی یہ الزام عائد کرتا رہا ہے کہ بنگلا دیشی حکومت بہت سے مسلح بھارت مخالف باغیوں کو اپنی سرزمین پر ٹھکانے بنانے کی اجازت دیتی ہے۔ اِس الزام تراشی نے دوطرفہ تعلقات کو غیر معمولی نقصان پہنچایا ہے۔

بھارت نے بی این پی پر پاکستانی خفیہ اداروں سے ساز باز کا الزام بھی عائد کیا ہے اور بنگلا دیش اِس الزام کی سختی سے تردید کرتا رہا ہے۔ ہرش وردھن شرِنگلا کا کہنا ہے کہ بھارت اور بنگلا دیش کے تعلقات میں بے اعتمادی اور مخاصمت کا زہر گھلا ہوا ہے۔ ہرش وردھن بھارتی پارلیمنٹ کے ایوانِ بالا راجیہ سبھا کے رکن ہیں۔ 'الجزیرہ' سے گفتگو میں اُن کا مزید کہنا تھا کہ بی این پی نے ۲۰۰۱ء سے ۲۰۰۶ء تک اقتدار کے دوران واضح طور پر بھارت مخالف لائن اپنائی اور پاکستان سے قریب تر ہوتی چلی گئی۔ بی این پی کی حکومت میں طارق رحمٰن بنیادی قوتِ محرکہ تھے۔ پارٹی اور حکومت کے بیشتر معاملات اور پالیسیوں پر اُن کا اثر و رسوخ غیر معمولی تھا۔

طارق رحمٰن پر بھروسا ممکن ہے!

وہ زمانے گزر چکے۔ اب بہت کچھ بدل چکا ہے۔ اب طارق رحمٰن پر بہت حد تک بھروسا کیا جاسکتا ہے۔ بیگم خالدہ ضیا کی حالت طویل مدت سے خراب تھی مگر جب نومبر میں اُنہیں اسپتال میں داخل کرکے وینٹی لیٹر پر رکھا گیا تب بھارت کے وزیراعظم نریندر مودی نے فوری رابطہ قائم کرکے بیگم خالدہ ضیا کی جلد صحت یابی کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا اور بی این پی نے بھی خاصی خوش دِلی سے شکریہ ادا کیا۔ ہرش وردھن کا کہنا ہے کہ طارق رحمٰن بھی اِس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ چکے ہیں کہ اگر اُنہیں وزیراعظم کی حیثیت سے کامیاب ہونا ہے تو بھارت کی طرف سے حمایت اور مدد کا حصول لازم ہے۔ وہ کسی بھی حال میں بھارت سے مخاصمت مول نہیں لے سکتے اور ایسا چاہتے بھی نہیں۔ اب صرف یہ دیکھنا باقی ہے کہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں، اُس پر پوری طرح سے عمل بھی کر پاتے ہیں یا نہیں۔

بھارت کی او پی جندل گلوبل یونیورسٹی میں جنوبی ایشیا سے متعلق امور کی پروفیسر سری رادھا دَتّہ کا کہنا ہے کہ اس وقت طارق رحمٰن جو کچھ بھی کہہ رہے ہیں وہ بھارت کے تناظر میں بہت خوش آئند ہے۔ 'الجزیرہ' سے گفتگو میں سری رادھا دَتّہ نے کہا کہ جب طارق رحمٰن لندن سے واپس آئے تو ڈھاکا کی سڑکوں پر لاکھوں افراد نے اُن کا خیر مقدم کیا۔ اِس سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ وہ بھارت کے پڑوس میں بہت حد تک استحکام پیدا کرنے کی صلاحیت کے حامل ہیں۔

تجزیہ کاروں کا کہنا ہے کہ بھارت کے لیے اِس وقت بنگلا دیش جماعتِ اسلامی کی قیادت میں قائم اتحاد اور دیگر سیاسی کھلاڑیوں کے مقابلے میں طارق رحمٰن زیادہ موزوں شخصیت ہیں جن پر بہت حد تک بھروسا کیا جاسکتا ہے۔

بنگلا دیش میں دس سال تک خدمات انجام دینے والے سابق امریکی سفارت کار ڈان ڈینیلو وِز کہتے ہیں کہ بھارت اِس وقت بنگلا دیش جماعتِ اسلامی اور طلبہ تحریک کے انقلابیوں کو اپنے مفادات کے لیے سب سے بڑے خطرے کے روپ میں دیکھ رہا ہے۔ ایسے میں طارق رحمٰن نے جلا وطنی کے خاتمے پر جو بیانات دیے ہیں اُن سے غیر معمولی پختگی جھلکتی ہے۔

جنوبی ایشیا کے امور کے متعلق سیاسی تجزیہ کار مائیکل کُگلمین کہتے ہیں کہ انتخابات سے قبل بی این پی اور بنگلا دیش جماعتِ اسلامی کی راہوں کا الگ ہو جانا بھی طارق رحمٰن پر نئی دہلی کے اعتماد میں اضافے کا ذریعہ بنا ہے۔ الجزیرہ سے گفتگو میں کُگلمین نے کہا کہ ماضی میں ایسا بہت کچھ ہوا ہے جسے بُھلانا کسی کے لیے آسان نہیں۔ بی این پی اور بنگلا دیش جماعتِ اسلامی کے درمیان کئی عشروں تک دوستی اور اتحاد رہا ہے۔ بھارت کے لیے یہ سب کچھ بھلانا ایسا آسان نہیں۔ کُگلمین کے مطابق طارق رحمٰن کو مکمل طور پر قبول کرنا بھارت کے لیے آسان نہیں تاہم حالات کا تقاضا ہے کہ ایسا کیا جائے۔ بھارتی قیادت یہ سب کچھ ''مرتا کیا نہ کرتا'' کے کھاتے میں کر رہی ہے۔

عوامی رابطوں کی بحالی

دو ملکوں کے درمیان تعلقات محض اعلیٰ سطح کی شخصیات کے مل بیٹھنے سے بحال نہیں ہوسکتے اور پروان بھی نہیں چڑھ سکتے۔ عوام کی سطح پر رابطوں کی بحالی بھی ناگزیر ہے۔ جب

تک بھارت اور بنگلا دیش کے عوام کے درمیان رابطوں کی گنجائش پیدا نہیں ہوگی تب تک دوطرفہ تعلقات میں حقیقی گرم جوشی پیدا نہیں ہوگی۔

طارق رحمٰن کے خارجہ امور کے مشیر ہمایوں کبیر نے خبردار کیا ہے کہ اگر ایک نیا اچھا آغاز کرنا ہے تو لازم ہے کہ ماضی سے تعلق ختم کیا جائے، جو کچھ ہو چکا ہے، اُسے بھلا دیا جائے۔ اگر ماضی سے رابطہ ختم نہ کیا گیا تو خطے میں حقیقی استحکام کا خواب شرمندۂ تعبیر نہ کیا جا سکے گا۔

بھارت یہ کہتا رہا ہے کہ وہ بنگلا دیش سے تعلقات کا حامل رہا ہے، اُس کی کسی پارٹی یا لیڈر سے نہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ اُس کے لیے شیخ حسینہ واجد بہت موزوں اور قابلِ قبول رہی ہیں۔ بھارت نے ہمیشہ اس بات کو ترجیح دی ہے کہ بنگلا دیش میں عوامی لیگ ہی اقتدار میں رہے۔

ہمایوں کبیر کہتے ہیں کہ جب شیخ حسینہ واجد وزیرِ اعظم تھیں تب بھارت کے لیے بنگلا دیش پالتو کتے سے زیادہ کی حیثیت کا حامل نہیں رہا تھا۔ اگر طارق رحمٰن اقتدار میں آتے ہیں تو خطے کی تمام طاقتوں سے وہ یکساں فاصلہ رہیں گے اور برابری کی بنیاد پر تعلقات استوار رکھنے کو ترجیح دیں گے۔ اُن کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش کے مفادات کو ہر حال میں ترجیح دی جائے گی اور بھارت کو چین پر یا چین پر بھارت کو ترجیح نہیں دی جائے گی۔

ہمایوں کبیر کہتے ہیں کہ شیخ حسینہ واجد نے اپنے جرائم کو جواز فراہم کرنے کے لیے بھارت کو بہت بھونڈے طریقے سے استعمال کیا۔ یہی سبب ہے کہ بنگلا دیش کے عوام بھارت کے لیے شدید مخالف جذبات کے حامل ہیں۔ جولائی ۲۰۲۴ء کے بعد ابھرنے والا ''نیا بنگلا دیش'' شیخ حسینہ واجد کو دہشت گرد کے روپ میں دیکھتا ہے۔

ہمایوں کبیر کا یہ بھی کہنا ہے کہ اگر فروری کے انتخابات میں بی این پی اقتدار میں آئی اور طارق رحمٰن وزیرِ اعظم بنے تو بنگلا دیش کی حکومت بھارت پر شیخ حسینہ واجد کی حوالگی کے لیے دباؤ ڈالتی رہے گی۔ دوطرفہ تعلقات کو بہتر بنائے رکھنے کی ذمہ داری بھارت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر وہ شیخ حسینہ واجد کو بنگلا دیش کے حوالے نہیں کرتا تو پھر تعلقات کی خرابی کی ذمہ داری اُسی پر عائد ہوگی۔

شیخ حسینہ واجد نے بھارت میں جلا وطنی کے دوران بنگلا دیش کی عبوری انتظامیہ کے سربراہ ڈاکٹر محمد یونس کی کارکردگی پر تنقید کی ہے جس کے نتیجے میں بنگلا دیشی اسٹیبلشمنٹ اُن کے بارے میں مزید مخاصمانہ جذبات کی حامل ہوئی ہے۔

ہمایوں کبیر کہتے ہیں کہ بھارتی قیادت کو اب شیخ حسینہ واجد سے آگے جانا چاہیے۔ ماضی کو بھول کر ایک نئے دور کی ابتدا کرنی ہے تو لازم ہے کہ بنگلا دیش میں اقتدار پانے والی جماعت پر بھرپور اعتماد کیا جائے اور معاملات کو خوش اُسلوبی سے بہتر بنانے پر توجہ دی جائے۔ کسی کو یہ نہیں لگنا چاہیے کہ شیخ حسینہ واجد بھارتی سرزمین پر بیٹھ کر بنگلا دیش مخالف سرگرمیوں میں ملوث ہیں اور اِس معاملے میں اُنہیں بھارت کی بھرپور حمایت اور مدد حاصل ہے۔ اگر بنگلا دیش کے عوام بھارت کو دشمن سمجھتے رہے اور اُس سے خُنّس کھاتے رہے تو بنگلا دیش کی نئی منتخب حکومت کے لیے بھارت کے ساتھ مل کر چلنا اور ڈھنگ سے کام کرنا انتہائی دشوار ہو جائے گا۔

بھارت اور بنگلا دیش کے درمیان دوریاں پیدا کرنے والے معاملات صرف سیاسی نہیں ہیں بلکہ کھیل کا میدان بھی ایسے معاملات سے بھرا پڑا ہے۔ بھارتی کرکٹ بورڈ نے انڈین پریمیر لیگ میں حصہ لینے والی ایک مرکزی ٹیم کولکتہ نائٹ رائیڈرز کو حکم دیا ہے کہ بنگلا دیش کے آل راؤنڈر مستفیض الرحمٰن کو ڈراپ کر دے۔ مستفیض الرحمٰن کی شمولیت پر بھارتیہ جنتا پارٹی کے رہنماؤں نے اعتراض کیا تھا۔

اب کیا ہوگا؟

بنگلا دیش میں پانچ سال تک خدمات انجام دینے والے سابق بھارتی سفارت کار انیل ٹرنگنایت کہتے ہیں کہ اگر بی این پی اقتدار میں آتی ہے تو بھارت کے لیے سب سے بڑا چیلنج پاکستان کو بنگلا دیش سے دور رکھنا اور بنگلا دیش کی سرزمین پر موجود اور فعال بھارت مخالف عسکریت پسند گروپوں کو کنٹرول کرنا ہوگا۔

ڈینیلو وِز کا کہنا ہے کہ بنگلا دیش جماعتِ اسلامی سے ماضی میں گہرے تعلقات کے باعث بی این پی کو بھارتی قیادت شک کی نظر ہی سے دیکھتی رہے گی اور اس حوالے سے تشویش کا اظہار بھی کرتی رہے گی۔

دوسری طرف ہمایوں کبیر کہتے ہیں کہ یہ تمام خدشات بے بنیاد ہیں کیونکہ طارق رحمٰن خطے کے تمام ممالک سے مساوی اور خوش گوار تعلقات استوار رکھنے پر یقین رکھتے ہیں اور کسی کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ اُن کا جھکاؤ کسی ملک کی طرف ہوگا۔ وہ بھارت اور چین اور تعلقات میں بھی معقول توازن قائم رکھنے کو ترجیح دے رہے ہیں۔ ہمایوں کبیر کا استدلال یہ ہے کہ شیخ حسینہ کے دورِ حکومت میں بھارت اور بنگلا دیش کے تعلقات تھے ہی نہیں۔ وہ تو بھارت اور شیخ حسینہ کے تعلقات کا دور تھا۔ اب ہمیں یقین ہے کہ بھارت نے حالت کو دیکھتے ہوئے اپنی پالیسی کی ترجیحات کا نئے سرے سے تعین کیا ہوگا اور عوامی سطح پر رابطوں کو بھی اہمیت دینے کے بارے میں سوچا ہوگا۔

(مترجم: محمد ابراہیم خان)

'New phase': India eyes Bangladesh thaw with BNP before elections.
("aljazeera". January 6, 2026)

اسلامک ریسرچ اکیڈمی کراچی کی چند مفید مطبوعات

سیرت سید الابرار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	منیر احمد خلیلی	1200/-
زندگی کے عام فقہی مسائل (حصہ اوّل تا پنجم)	رضی الاسلام ندوی	2500/-
بچوں میں خوف اسباب، علامات، تدارک کی تجاویز	فوزیہ عباس	150/-
بچوں سے گفتگو کیسے کریں؟	حفصہ صدیقی	300/-
آزاد بچے آزاد والدین	ظہور الدین خان	500/-
بچوں کے ذہنی امراض	فوزیہ عباس	400/-
منتخب الحکایات	ڈپٹی نذیر احمد	1000/-

Sayyidina Muhammad	Ahmed Imam Shafaq Hashemi	500/-
Soul Whisperer	Almas Taufique	500/-

اور دیگر بیسیوں کتابیں اور کتابچے قاری کے لیے مفید اور کتب خانے کی زینت!

اکیڈمی بک سینٹر
ڈی۔۳۵، بلاک۔۵، فیڈرل بی ایریا، کراچی
فون: ۳۶۳۶۸۰۲۰ (۰۲۱) برقی پتا: irak.pk@gmail.com

بھارت کو ہتھیار بیچنے میں وقت لگے گا!

وسعت اللہ خان

گزشتہ برس اکیس نومبر کو دوبئی ایئر شو میں فضائی کرتب کے دوران بھارتی ساختہ لڑاکا طیارے تیجس کی تباہی اور وِنگ کمانڈر نمانش سیال کی موت کوئی حیران کن حادثہ نہیں۔ فضائی نمائشوں کی تاریخ میں اس سے بڑے المیے رونما ہوئے ہیں۔

۱۹۷۳ء میں پیرس ایئر شو کے دوران ایروفلوٹ کا پہلا سپرسانک ٹیوپولوف ٹی یوون فورٹی فور طیارہ پہلی نمائشی پرواز کے دوران ہی گر پڑا۔ عملے کے تمام پانچ افراد اور زمین پر موجود دیگر آٹھ افراد ہلاک ہوگئے۔

۱۸/اگست ۱۹۸۸ء کو مغربی جرمنی میں امریکی فضائیہ کے زیرِ استعمال رامسٹین ایئر بیس کے فضائی میلے میں آسمانی کرتب دکھانے والے اطالوی فضائیہ کے تین طیارے ٹکرا کر آگ کا گولہ بن گئے۔ تینوں پائلٹوں سمیت ۷۰/افراد ہلاک اور ۳۵۶ تماشائی شدید زخمی ہوگئے۔

۸/اکتوبر ۱۹۸۹ء کو بھارتی یومِ فضائیہ کے موقع پر دہلی میں ایک میراج طیارہ قلابازیوں کا مظاہرہ کرتے ہوئے نیچے گر پڑا۔ ونگ کمانڈر رمیش بخشی اور زمین پر کھڑا ایک اور شخص جان کی بازی ہار گئے۔

جولائی ۱۹۹۷ء میں بلجیم میں اوسٹینڈ ایئر شو کے دوران اردنی فضائیہ کا ایک طیارہ کرتب دکھانے کے لیے ٹیک آف کے دوران نیچے گر پڑا۔ پائلٹ سمیت ۸/افراد ہلاک اور ۴۰ زخمی ہوئے۔

جولائی ۲۰۰۲ء میں یوکرین میں ایک فضائی نمائش کے دوران کرتب دکھاتے ہوئے یوکرینی فضائیہ کا سوخوئی طیارہ توازن کھونے کے سبب نیچے گر پڑا۔ اُس وقت نمائش میں دس ہزار تماشائی موجود تھے۔ ۲۸ بچّوں سمیت ۷۷/افراد ہلاک اور ۵۵۰ زخمی ہوئے اور نیچے کھڑے کئی طیارے تباہ ہوگئے۔ مگر حادثاتی طیارے کے دونوں پائلٹ زندہ بچ گئے۔

البتہ ایسے حادثات کے کاروباری نقصانات بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً دوبئی ایئر شو میں تیجس کا پائلٹ سمیت تباہ ہوجانا ایک ایسا حادثہ ہے جس کے سبب بھارتی ایوی ایشن انڈسٹری کی شہرت اور صلاحیت پر بھی کچھ بنیادی سوالات اٹھائے جارہے ہیں۔

ویسے بھی دنیا میں چند ہی ممالک ہیں جن کے درمیان ہتھیاروں کی تجارت کا گلا کاٹ مقابلہ ہے۔ ایسا کوئی بھی حادثہ ہتھیار فروخت کرنے والے ملک کی شہرت پر وقتی طور پر سہی مگر سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔ اس ملک کا نقصان کروڑوں اربوں ڈالرز کے آرڈرز کی شکل میں اسلحے کے دیگر تاجر ممالک کو فائدہ پہنچاتا ہے۔

جیسے انڈونیشیا نے فرانس سے رافیل طیاروں کی خریداری کا سودا کیا مگر پاکستان سے لڑائی کے دوران ایک بھارتی رافیل کی تباہی کے بعد انڈونیشیا نے سودا منسوخ کردیا اور طیارہ ساز کمپنی کے حصص کی قیمت بھی گر گئی۔

فورتھ جنریشن کا تیجس بھارتی اسلحہ انڈسٹری کے سر کا تاج ہے۔ تیجس کا یہ پہلا حادثہ نہیں۔ مارچ ۲۰۲۴ء میں جیسلمیر کے قریب ایک تربیتی پرواز کے دوران پہلا تیجس گر کے تباہ ہوا۔ خوش قسمتی سے پائلٹ محفوظ رہا۔

تیجس ۱۹۸۳ء میں ڈرائنگ بورڈ پر آیا مگر اس کی پہلی ٹیسٹ فلائٹ ۱۷/برس بعد ۲۰۰۱ء میں ممکن ہوسکی۔ اس کے ۵۵ فیصد آلات ہندوستان ایرونائکس لمیٹڈ نے تیار کیے ہیں۔ ریڈار اور الیکٹرونکس سسٹم ساختہ اسرائیل ہے۔ اس میڈ اِن انڈیا طیارے کی تیاری پر ۱۹۸۳ء سے اب تک ڈیڑھ بلین ڈالر خرچ ہوچکے ہیں۔

ہندوستان ایروناٹیکل لمیٹڈ (ایچ اے ایل) عرصے سے طیارے اور ہیلی کاپٹر تیار کررہا ہے مگر سب سے بڑا گاہک یعنی بھارتی فضائیہ بھی ایچ اے ایل کی کارکردگی سے مطمئن نہیں۔ تیجس مارک ون کی پروڈکشن ۲۰۰۶ء میں شروع ہوگئی۔ ۲۰۱۱ء تک بیس طیارے فضائیہ کے حوالے کرنے کا ہدف مقرر کیا گیا تاہم یہ ڈلیوری ستمبر ۲۰۲۴ء میں مکمل ہوسکی۔

فضائیہ کے سربراہ ایئر چیف مارشل اے پی سنگھ نے تو کھلم کھلا چند ماہ پہلے کہہ دیا کہ فضائیہ کو ایچ اے ایل کی کارکردگی پر اعتماد نہیں۔ ایچ اے ایل نے گزشتہ فروری تک گیارہ تیجس فضائیہ کے حوالے کرنے کا وعدہ کیا تھا۔ لیکن وہ ان میں سے ایک بھی طیارہ وعدے کے مطابق ڈلیور نہ کرسکی۔ مگر اب فضائیہ کو ۴ طیارے بالآخر مل گئے ہیں۔ بھارتی فضائیہ اپنے بیڑے میں ۳۲۴ تیجس (اٹھارہ اسکواڈرن) شامل کرنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ تاکہ مگ اکیس نامی ''فضائی تابوت'' سے گزشتہ برس جان چھوٹنے سے پیدا ہونے والا خلا بھرا جاسکے۔ مگر پروڈکشن اور سپلائی لائن پر کلرک مزاج سرکاری بابو بیٹھے ہیں۔ بھارتی فضائیہ کا تین سو سے زائد طیاروں کا آرڈر ۲۰۳۲ء سے پہلے مکمل ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

جس قیمت پر تیجس غیر ملکی گاہکوں کو مہیا کیا جاتا ہے، اُسی قیمت میں دوبئی ایئر شو میں چینی ساختہ جے ایف سیونٹین، جے ٹین اور جے تھرٹی ون طیارے اور سویڈن کا گرو پن بھی موجود تھا۔

دوبئی ایئر شو میں تیجس کی تباہی کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ آرمینیا نے ایک اعشاریہ دو بلین ڈالر مالیت کے ۱۲/طیاروں کی خریداری کا سودا معطل کردیا۔ یہ اس لیے بھی نیک شگون نہیں کہ پہلی بار کسی ملک نے تیجس خریدنے میں سنجیدگی سے دلچسپی ظاہر کی تھی۔ برازیل، ارجنٹینا، کانگو، مصر اور ملیشیا بھی تیجس کو مختلف اوقات میں شارٹ لسٹ کرچکے ہیں مگر سخت بین الاقوامی مقابلے کے سبب یہ بیل کہیں بھی منڈھے نہیں چڑھ سکی۔

معاملہ صرف تیجس کی مارکیٹنگ کو دھچکا لگنے تک محدود نہیں۔ ہندوستان ایرو ناٹکس لمیٹڈ نے ۲۰۰۸ء میں جنوبی امریکا کے ملک ایکویڈور کی فضائیہ کو ۴۲٫۵ ملین ڈالر مالیت کے ۷ دھرو ایڈوانس ہیلی کاپٹر فروخت کیے۔ بھارتی فوجی ہیلی کاپٹرز کا یہ پہلا بڑا بین الاقوامی آرڈر تھا۔

مگر سات میں سے چار ہیلی کاپٹر یکے بعد دیگرے تکنیکی وجوہات کے سبب کریش ہوگئے۔ ایکویڈور نے ۲۰۱۵ء میں ایچ اے ایل سے مزید ہیلی کاپٹرز کی خریداری کا سودا ہی منسوخ کردیا۔

۲۰۲۲ء میں ایچ اے ایل کے سربراہ انتھا کرشن نے اعلان کیا کہ ارجنٹینا، مصر اور فلپینز دھرو ہیلی کاپٹر خریدنے پر آمادہ ہیں۔ مگر اس اعلان کے چند ماہ بعد ایک اور دھرو ہیلی کاپٹر اروناچل پردیش میں کریش کرگیا۔ اس کے بعد اس ہیلی کاپٹر کی برآمد کے چراغوں میں روشنی نہ رہی۔ معلوم نہیں کہ یہ ہیلی کاپٹر بھارتی فضائیہ بھی خوشی خوشی استعمال کررہی ہے یا اسے زبردستی ٹکایا گیا ہے۔

اگرچہ امریکا، برطانیہ، فرانس، روس اور چین جیسے ممالک کے طیارے بھی حادثات کا شکار ہوتے رہے ہیں مگر یہ ممالک چونکہ اس میدان کے پرانے کھلاڑی ہیں لہٰذا گاہکوں پر ان کا اعتماد کسی ایک پروڈکٹ کے نقصان کے سبب وقتی طور پر تو متزلزل ہوتا ہے تاہم ان ممالک کی عسکری مصنوعات اتنی ہیں کہ کسی ایک نقصان سے ان کی تجارتی صحت پر زیادہ اثر نہیں پڑتا۔ بھارت جیسے ممالک چونکہ اسلحے کی فروخت کے میدان میں نئے نئے ہیں اور ان کے پاس بیچنے کے لیے آئٹم بھی کم ہیں۔ ایسے میں کوئی ایک گڑبڑ بھی گاہک کا اعتماد گڑبڑانے کے لیے کافی ہے۔

////// باقی صفحہ نمبر ۱۲ \\\\\\

اسرائیلی جیل میں ۴۵ برس

طویل ترین قید کاٹنے والے فلسطینی سے ملاقات

افتخار گیلانی

ترکیہ کے شہر استنبول کے ایک پانچ ستارہ ہوٹل کے اندر چمکتے ہوئے سنگِ مرمر اور نرم روشنیوں سے سجے کانفرنس ہال میں فلسطین پر ایک بین الاقوامی کانفرنس کے سیشن چل رہے تھے۔

ہر کرسی پر ترجمے کے ہیڈ سیٹ ترتیب سے رکھے تھے۔ دنیا بھر سے سفارت کار، دانشور، سیاسی و سماجی کارکن اور صحافی ہال میں موجود تھے۔

اس کانفرنس کے ایک سیشن میں جب نائل البرغوثی نے بولنا شروع کیا، تو چند لمحوں میں ہی اوپر جھلملاتے فانوس غیر متعلق محسوس ہونے لگے۔

چند ہی لمحوں میں ہال کسی عالیشان مقام کے بجائے ایک بند، بھاری اور دَم گھونٹ دینے والی جگہ بن گیا، جیسے دیواروں نے دہائیوں کا دُکھ اپنے اندر جذب کر لیا ہو۔ میرے پیچھے سسکیوں کی آوازیں آنے لگیں۔

چند قطار پیچھے بیٹھی ایک عورت نے دونوں ہاتھوں سے اپنا چہرہ ڈھانپ لیا، اس کے کندھے ہچکیاں لے رہے تھے۔ دروازے کے قریب بیٹھا ایک بوڑھا شخص بار بار اپنی آنکھیں پونچھ رہا تھا، شاید ان آنسوؤں پر خود حیران اور شرمندہ جو رُکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

ہال کے پچھلے حصّے سے دبی دبی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ یہ بے اختیار آوازیں جو اُس وقت نکلتی ہیں جب غم وقار سے پہلے سطح پر آ جاتا ہے۔ کوئی ایک چہرہ بھی بے اثر نہ تھا۔

برغوثی بغیر کسی نوٹس کے بول رہے تھے۔ ان کی آواز بلند نہیں تھی۔ نہ کوئی ڈرامہ، نہ الزام، نہ فریاد تھی۔ وہ انتہائی سکون اور وضاحت کے ساتھ اسرائیلی جیل میں ان کے گزرے پینتالیس برسوں کی دردناک کہانی سنا رہے تھے۔

چار دہائیوں کی تاریکی کے بعد البرغوثی نے روشنی میں قدم رکھا تھا۔ جب وہ خاموش ہوئے تو پورا ہال ایک جسم بن کر کھڑا ہو گیا۔ فوراً تالیاں نہیں بجیں۔ پہلے گہری اور باوقار خاموشی آئی۔

پھر تالیوں کی آواز، ابتدا میں ہچکچاہٹ کے ساتھ، پھر بڑھتی ہوئی، پھیلتی ہوئی، پورے ہال کو بھر دینے والی جوش سے بھری آوازیں ابھریں۔ لوگ دیر تک کھڑے رہے۔

برغوثی کے اسٹیج سے نیچے اترتے ہی لوگ ان کو چھو کر جیسے یقین کر رہے تھے کہ کیا یہ شخص واقعی گوشت و پوست کا انسان ہے، جو اسرائیل کی جیل سے زندہ باہر نکل آیا ہے۔

ہال کے باہر صحافیوں کا ہجوم ان کی طرف مائک و کیمرے لے کر لپک رہے تھے۔ ان پر عربی، ترکی اور انگریزی میں سوالوں کی بوچھاڑ ہو رہی تھی۔

وہ سب کے جواب تحمل سے دے رہے تھے، نہ جھنجھلاہٹ، نہ عجلت۔ جیسے وقت، جس نے کبھی انہیں بے رحمی سے کچلا تھا، اب ان پر حکم نہیں رکھتا تھا۔

جب ہجوم کچھ کم ہوا تو میں نے آگے بڑھ کر اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے پوری توجہ سے سنا، ان کی نگاہ ٹھہری ہوئی تھی، ویسی ہی جیسی قیدی سیکھ لیتے ہیں۔ میں نے اپنے جیل کے چند واقعات بتائے۔ ان کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آئی۔ یوں ہماری گفتگو شروع ہوئی۔

قد آور اور دبلے پتلے نائل البرغوثی کی عمر ۶۷ برس ہے۔ ان کا جسم محرومی کی طویل چھاپ اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ بال مکمل سفید ہو چکے ہیں، چہرے پر گہری لکیریں ہیں، جو صرف عمر کی نہیں بلکہ دہائیوں کی ضبط اور برداشت کی گواہ ہیں۔

ان کی آنکھیں تیز اور چوکنی ہیں، ان میں ایک پُرسکون شدت بے چین کر دیتی ہے۔ ان کا لباس سادہ تھا، جسم پر ڈھیلا لٹکتا ہوا، ایک ایسے وجود پر جو برسوں کی قید سے کمزور ہو چکا ہو۔ چہرہ لکیروں سے بھرا تھا۔ یہ لکیریں صرف عمر کی نہیں تھیں بلکہ برداشت، ضبط اور طویل خاموشیوں کی علامت تھیں۔

میں نے جب ان سے زندان میں گزری زندگی کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ''اگر کوئی پینتالیس سال کی قید کے بارے میں بات کرنا چاہے تو ایک دو گھنٹے کافی نہیں۔ کتابیں بھی کافی نہیں ہوں گی۔''

اسٹیج سے جب ان کا تعارف کرایا گیا تھا، تو ان کو فلسطینی قیدیوں کا ڈین یا عمید بتایا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ وہ اس لقب سے بے چین ہیں جو اکثر ان کے نام کے ساتھ جوڑا جاتا ہے۔ مجھے اس پر فخر نہیں، انہوں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ یہ مجھے عزت نہیں دیتا۔ کسی فلسطینی کو چند دن بھی جیل میں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ پینتالیس سال؟ یہ لقب خود ایک الزام ہے۔ تھوڑی دیر رک کر انہوں نے کہا؛

''میری پہچان سب سے پرانا قیدی نہیں، میں ایک فلسطینی مجاہد ہوں۔ ایک ایسا انسان جو اپنے حق کے لیے لڑا ہے۔''

برغوثی ۲۳؍اکتوبر ۱۹۵۷ء کو مغربی کنارہ کے فلسطینی شہر رملہ کے شمال میں واقع گاؤں کوبر میں پیدا ہوئے۔ ان کا خاندان زراعت کے پیشے سے تعلق رکھتا تھا۔

زمین اور زیتون کے درختوں کے ساتھ ان کے خاندان کا گہرا تعلق تھا۔ جو روزی بھی تھے اور شناخت بھی۔ مزاحمت ان کے خاندانی ورثے میں شامل تھی۔ ان کے والد کو برطانوی دورِ انتداب میں حراست میں لیا گیا تھا۔

ایک چچا ۱۹۳۶ء کی عظیم عرب مزاحمت میں مارے گئے۔ وہ دس برس کے تھے جب جون ۱۹۶۷ء میں اسرائیلی افواج نے مغربی کنارے پر قبضہ کیا۔

انہیں یاد ہے کہ کیسے فوجی کوبر میں داخل ہوئے۔ وہ دھماکے کر رہے تھے اور بچے ان پر پتھر پھینک رہے تھے۔ اس دن ان کے اندر کچھ بس گیا، جو پھر کبھی نہیں نکلا۔ جوانی میں انہوں نے اپنے بڑے بھائی عمر اور کزن فخری کے ساتھ مزاحمتی سرگرمیوں میں حصہ لیا۔ پہلی گرفتاری دسمبر ۱۹۷۷ء میں ہوئی۔ تین ماہ قید کے بعد رہائی ملی۔

وہ گھر لوٹے، ہائی اسکول کے امتحانات کی تیاری کر رہے تھے کہ اسرائیلی افواج نے انہیں دوبارہ گرفتار کر لیا۔ اس بار جیل کا دروازہ دہائیوں کے لیے بند ہو گیا۔ ۱۹۷۸ء میں برغوثی پر ایک اسرائیلی افسر کے قتل میں ملوث ہونے کا الزام لگایا گیا اور ان کو سرسری سماعت کے بعد عمر قید کی سزا سنائی گئی۔ وہ بمشکل بیس برس کے تھے۔

میں لڑکا تھا جب جیل میں داخل ہوا، اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر انہوں نے کہا۔ اب بوڑھا ہو گیا ہوں۔ اگلے ساڑھے چار عشروں میں انہیں تقریباً ہر اسرائیلی جیل میں منتقل کیا گیا۔

گلبوع، بیرشیبہ کے تمام حصے، رملہ، نفحہ، ریمون، اشکلون، نقب، یہ سبھی جیلیں میرا ٹھکانہ رہ چکی ہیں۔ اسرائیلی جبر دکھانے اور اذیتیں دینے میں تخلیق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ ایک جبر ختم تو دوسرا طریقہ شروع۔

گیارہ برس انہوں نے ایک ہی جیل میں گزارے، جن میں سے آٹھ برس ایک ہی سیل کی دیواروں کو تکتے ہوئے صرف ہوئے۔ نوقیدیوں کے لیے بنے سیل میں پندرہ افراد تھے۔ ٹھنڈی کنکریٹ کی فرش پر جسم جسم سے جڑے ہوئے ہوتے تھے۔ نہ پھیلنے کی جگہ، نہ رازداری۔ جیل، ان کے

مطابق، صرف قید کی جگہ نہیں تھی۔

یہ ایک ایسا نظام تھا جو انسانی روح کو آہستہ آہستہ، منصوبہ بند طریقے سے تھکانے کے لیے بنایا گیا تھا، بغیر ایسے نشانات چھوڑے جو باہر کی دنیا کو الرٹ کر دیں۔

اشکلون جیل ان کی یاد میں سب سے زیادہ وحشیانہ جگہوں میں سے ایک کے طور پر نقش ہے۔ وہاں تشدد کوئی استثنیٰ نہیں بلکہ معمول تھا۔ جب قیدی بنیادی حقوق کے لیے بھوک ہڑتال کرتے، تو جواب میں زبردستی خوراک دی جاتی۔ اس کو بھی اذیت کا ذریعہ بنایا جاتا تھا؛

''ربڑ کی استعمال شدہ نالیاں منہ یا ناک میں زبردستی ڈالی جاتی تھیں، وہ نالی اتنی نیچے دھکیلتے کہ خون بہنے لگتا۔ پھر انتہائی گرم دودھ، نمک ملا کر، پیٹ میں انڈیل دیتے تھے۔ قیدیوں کو باندھ دیا جاتا تھا تاکہ حرکت سے محروم ہو جانے پر وہ مزاحمت نہ کر سکیں۔ ایک قیدی کے منہ سے نالی نکالی جاتی اور دوسرے کے منہ میں ڈال دی جاتی تھی۔ اس طرح کچھ لوگوں کے پھیپھڑے بیکار ہو گئے، کیونکہ دودھ ان میں چلا گیا تھا۔''

برغوثی جب یہ بیان کر رہے تھے، تو میں نے دیکھا کہ ان کی آنکھیں بند تھیں۔ شاید ان کا ذہن دوبارہ جیل میں پہنچ گیا تھا۔ وہ بتا رہے تھے؛

''مارپیٹ روز روز کی غذا تھی۔ نقاب پوش محافظ سیلوں پر دھاوا بولتے، ڈنڈوں، بوٹوں اور مکّوں سے حملہ کرتے۔ بند جگہوں میں آنسو گیس چھوڑی جاتی تھی۔ اسٹن گرنیڈ پھٹتے۔ قیدیوں پر خوفناک کتّے چھوڑے جاتے تھے، جن کو ایسی ہی تربیت دی جاتی تھی۔'' اس کے ساتھ انہوں نے اپنی آستینیں اوپر کر کے بازو دکھائے، جن پر ان گنت نشانات پڑے ہوئے تھے۔ ان کے بازو کو بھنبھوڑا گیا تھا۔

کئی قیدی تشدد میں مارے گئے۔ جو بچ گئے، وہ میری طرح مستقل زخموں کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ کئی قیدی ٹوٹی پسلیوں، خراب اعضا اور دائمی درد کے ساتھ پسِ زندان ہیں۔

اسرائیلی جیلوں میں کھانے کے نظم کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ ''کھانا بس اتنا دیا جاتا تھا کہ ان پر قیدیوں کو بھوک سے مارنے کا الزام نہ آئے۔ چائے کے کپ سے بھی چھوٹے برتن میں پتلا سا سوپ۔ نہ پھل، نہ گوشت۔ کیلوریز اس طرح ناپی جاتیں کہ قیدی بس زندہ رہیں۔ یہ پیسہ بچانے کے لیے نہیں بلکہ کنٹرول کے لیے تھا۔''

برغوثی کا وزن بیس کلو سے زیادہ کم ہو گیا تھا۔ دوسروں کا اس سے کہیں زیادہ، بعض کا ستر کلو تک وزن کم ہو گیا۔ دانتوں کے درد کا علاج ہی نہیں کیا جاتا۔ قیدی ہفتوں سوجھے چہروں کے ساتھ زندگی گزارتے تھے، نہ سو سکتے، نہ کھا سکتے، نہ سوچ سکتے تھے۔ کسی کو درد کی ایک گولی تک نہیں ملتی تھی۔

انہوں نے کہا کہ ''سوچیں، کسی کے ساتھ ایک کمرے میں ہفتوں رہنا، جب وہ ناقابلِ برداشت درد کی حالت میں ہو اور آپ کچھ نہ کر سکنے کی پوزیشن میں ہوں۔ بے بسی کی ایسی انتہا حالت میں بس مرنے کی ہی دعا کی جا سکتی ہے۔''

اس تشدد کے خلاف اور حقوق کی آواز بلند کرنے جیسے اہل خانہ سے ملاقاتیں، قید تنہائی کا خاتمہ، بچے یا ماں سے ملاقات منوانے کے لیے قیدیوں کے پاس بس بھوک ہڑتاک کے سوا کوئی اور ہتھیار نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں اپنی تمام بھوک ہڑتالیں گنوں، تو یہ تقریباً دو سال بغیر کھانے کے بنتی ہیں یعنی اس کا دورانیہ سات سو تیس دن کا ہے۔ جب ایک قیدی کو تنہائی میں ڈالا جاتا، تو دوسرے یکجہتی میں بھوک ہڑتال کرتے۔

برغوثی نے کہا کہ وہ ہمارے اندر کی انسانیت مارنا چاہتے تھے۔ ہم نے بھوک بانٹ کر مزاحمت کی۔ اپنی قید تنہائی کا ذکر کرتے ہوئے اس فلسطینی قیدی نے کہا کہ ان کے خیال میں قید تنہائی شخصیت مٹانے کے لیے بنائی گئی ہے۔ قید تنہائی میں وہ سیل میں رینگتے ہوئے کاکروچ اور دیگر کیڑے مکوڑوں سے باتیں کرتے تھے۔ خوف تھا کہ کہیں وہ بولنا ہی بھول نہ جائیں؛

مگر اس دوران میں نے دیکھا کہ اگر ایک کاکروچ کو نقصان پہنچتا تھا، تو دیگر اس کی مدد کرنے پہنچ جاتے تھے۔ اس کو دیوار پر چڑھنے میں مدد کرتے تھے۔ ایک فلسفی کے انداز میں برغوثی نے سوال کیا کہ انسان دیگر انسانوں کی مدد کیوں نہیں کر پاتا ہے؟

اپنے برادر اکبر عمر کے ساتھ رشتہ ان کی جیل کی زندگی کا بڑا حصہ رہا۔ عمر چار سال بڑے تھے، اور وہ بھی مزاحمت کے علمبردار تھے۔ ۱۹۸۵ء میں جب قیدیوں کے تبادلے ہونے والے تھے، تو نائل کا نام فہرست میں تھا۔ تین ماہ پہلے اسرائیلی حکام نے مجھے بتایا کہ میرا نام رہا ہونے والے فلسطینیوں میں شامل ہے، تو میں نے کہا کہ ''اگر سب کو رہا کیا جاتا ہے، تو ہی میں جیل سے باہر نکلوں گا۔ اگر صرف لسٹ میں شامل قیدیوں کی ہی رہائی ہونی ہے، تو میں اپنی جگہ عمر کو شامل کروانا چاہتا ہوں۔''

عمر رہا ہو گئے۔ نائل وہیں رہے۔ بعد میں انتفاضہ کے دوران عمر کو دوبارہ قیدی بنایا گیا۔ بہت سے رہا شدہ قیدی دوبارہ واپس جیلوں کی زینت بن گئے۔

برغوثی نے والدین جیل میں رہتے ہوئے کھو دیے۔ انہیں الوداع کہنے کی اجازت نہیں ملی۔ ۲۰۰۴ء میں قیدیوں نے انیس دن کی بھوک ہڑتال کی۔ ان کے والد باہر یکجہتی کے مظاہروں میں شامل ہوئے۔ کچھ ہی عرصے بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ماں کی موت بھی اسی طرح آئی۔

قیدیوں کے لیے فلسطینی حکام نے ایک ایف ایم ریڈیو اسٹیشن قائم کیا تھا۔ قیدی اس ایف ایم کے پروگراموں کو چھوٹے ٹرانسٹروں پر سنتے ہیں۔ اس پر رات گیارہ بج کر تین منٹ پر ان کی ماں کی آواز سنائی دی۔ اس نے کہا؛

''عزت کا گھر دولت کے گھر سے بہتر ہے۔'' پھر اسی رات دو بجے ان کا انتقال ہو گیا۔ ''دنیا دھندلی بن گئی،'' انہوں نے کہا: ''والدین کو کھونا زندگی کا ایڈریس کھو دینے جیسا ہے۔ میں اندر سے تو ٹوٹ گیا تھا۔ مگر باہر سے خود کو سنبھالے رکھا۔'' میں اپنی کمزوری جوان قیدیوں پر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اسی قید کے دوران برغوثی نے ایمان نافی سے شادی کی، جو خود ایک سابق قیدی رہ چکی تھی۔ یہ بھی مزاحمت کی ایک صورت تھی۔ میری بیوی مجھے ہر روز فلسطین کے گلی کوچوں کی تصویریں بھیجتی تھی، تاکہ میں جڑا رہوں۔ ان کے نزدیک محبت جیل میں بقا ہے۔ جیل میں قیدی کے پاس آیا خط چھوٹی چیز نہیں ہوتی ہے۔

انہوں نے درد کے ساتھ مرحوم فلسطینی ادیب ولید دقہ کا ذکر کیا، جنہیں اسرائیلی قید میں اپنی بیوی یا بیٹی کو گلے لگانے کا حق نہ ملا۔ ہمیں جس چیز نے سنبھالا وہ تھی کہ باہر کوئی ہم سے محبت کرتا ہے اور ہمارے دکھوں کا ساتھی ہے۔ برغوثی نے کہا: ''ہمیں رومیو اور جولیٹ کی ضرورت نہیں۔ ہمارے پاس ایسی ہزاروں کہانیاں ہیں۔''

برغوثی جب نوعمری میں جیل میں چلے گئے تو تعلیم کا سلسلہ چھوٹ گیا تھا۔ مگر جب ۲۰۰۲ء میں فلسطینی رہنما مروان برغوثی کو پابندِ سلاسل کر کے عمر قید کی سزا سنائی گئی، تو انہوں نے جیل میں بند دیگر فلسطینیوں کو مطالعہ کی ترغیب دی۔

اس کے نتیجے میں نائل برغوثی بھی خاصے وسیع المطالعہ ہیں۔ وہ عربی کے علاوہ عبرانی اور انگریزی روانی سے بولتے ہیں، اور عالمی تاریخ سے واقف ہیں۔

ہماری گفتگو میں انہوں نے برصغیر کی تاریخ کا ذکر کیا۔ انہوں نے مہاتما گاندھی، محمد علی جناح، جواہر لعل نہرو، ابوالکلام آزاد، مولانا محمد علی جوہر کو پڑھا ہے۔ حتیٰ کہ کشمیر کا جب ذکر آیا تو اس کی تاریخ کے ساتھ، انہوں نے رہنماؤں، جیسے شیخ عبداللہ اور سید علی شاہ گیلانی کا بھی ذکر کیا۔ جب میں

نے پوچھا کہ یہ وسعت کیسے حاصل ہوئی، تو وہ مسکرائے۔ ''جیل نے ہمیں پڑھنے دیا'' انہوں نے کہا۔

وہ اس کے لیے مروان برغوثی کو کریڈٹ دیتے ہیں کہ ''انہوں نے فلسطینی قیدیوں کو تعلیم کی طرف راغب کیا۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری تعلیم معاشرے کو فائدہ نہیں دے سکے گی کیونکہ ہماری قسمت میں تو جیل میں ہی مرجانا لکھا ہے۔ مگر یہ یقین ہے کہ ہم اللہ کے پاس جاہل نہیں، باخبر ہوکر جائیں گے۔''

برغوثی کو فروری ۲۰۲۵ء میں غزہ جنگ بندی سے منسلک قیدی تبادلے کے تحت رہا کر دیا گیا۔

مگر جب فہرست میں ان کا نام آیا تو اسرائیل نے شرط رکھی کہ ''ان کو فلسطینی علاقوں میں رہنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ان کو جلاوطن کیا جائے گا'' ابتدا میں جب جیل میں ان کو بتایا گیا کہ رہا ہونے کے فوراً بعد ان کو مصر بھیجا جائے گا، تو انہوں نے رہا ہونے سے منع کر دیا۔

انہوں نے کہا: ''قید جلاوطنی سے کم تلخ ہے۔'' مگر ثالثوں کے دباؤ میں انہوں نے رہائی قبول کی، کیونکہ خدشہ تھا کہ اگر مذاکرات ٹوٹ گئے تو غزہ کی امداد یا دوسرے قیدیوں کی رہائی بھی متاثر ہوگی۔ انہوں نے کہا کہ ''یہ موت کے پروانے جیسا تھا''۔

انہیں اپنی زمین، اپنے گھر، اپنے زیتون کے درختوں سے جدا کر کے قاہرہ بھیج دیا گیا۔ دہائیوں کے تشدد سے تھکا ہوا جسم کئی بیماریوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے اب وہ ترکیہ میں علاج کرا رہے ہیں۔ دائمی درد، چوٹوں اور ان بیماریوں کے ساتھ جو جیل کی دیواروں کے اندر خاموشی سے جمع ہوتی رہیں، اب ان کو پریشان کر رہی ہیں، پھر بھی ان کا یقین قائم ہے۔ وہ بتا رہے تھے کہ ان کی جدوجہد ختم نہیں ہوئی ہے اور وہ اب بھی مزاحمت کر رہے ہیں۔

ان سے بات چیت کرتے ہوئے وقت گزرنے کا پتا ہی نہیں چل سکا۔ کئی لوگ اردگرد جمع ہوگئے تھے جو ان کا ہاتھ چھونا چاہتے تھے۔ نائل البرغوثی پینتالیس برس بعد جیل سے باہر آئے۔ مگر جیل، اس کی تاریکی، اس کی گواہی اور اس کے بے جواب سوال، سب ان کے ساتھ ہی باہر آئے۔ وہ اقبال کے اس شعر کی ایک عملی تفسیر معلوم ہو رہے تھے؛

یقین محکم، عمل پیہم، محبت فاتح عالم
جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۷ جنوری ۲۰۲۶ء)

اسرائیل کا وجود ہی خدا سے بغاوت کا تسلسل

افتخار گیلانی

ترکیہ کے عروس البلاد استنبول میں دسمبر کی سردی غیر معمولی تھی۔ آبنائے باسفورس کی طرف سے چلتی تیز ہوا کانفرنس ہال کے باہر کھڑے لوگوں کو اپنے کوٹ کے بٹن مضبوطی سے بند کرنے پر مجبور کر رہی تھی۔

ہلکی بارش، سرمئی آسمان اور یخ بستہ موسم کے باوجود فلسطین پر منعقد ہونے والی دوروزہ بین الاقوامی کانفرنس میں خاصی گہما گہمی تھی۔

اس کانفرنس کا اہتمام القدس انٹرنیشنل انسٹی ٹیوشن نے کیا تھا، اور اسی مقصد کے لیے نیویارک سے ایک آرتھوڈوکس یہودی ربی ڈیوڈ فیلڈمین استنبول آئے تھے۔

ہال کے اندر کا منظر سرد موسم کے برعکس تھا۔ اسٹیج کے عقب میں القدس اور مسجد اقصیٰ کے عکس، فلسطین سے یکجہتی کے پیغامات، اور سامنے قطار در قطار کرسیوں پر دنیا بھر سے مندوبین براجمان تھے۔

انہی میں ایک کرسی پر یہودی مذہبی لباس سیاہ لمبا کوٹ، چوڑی سیاہ ٹوپی زیب تن کیے، گھنی داڑھی والے ربی ڈیوڈ فیلڈمین خاموشی سے بیٹھے تھے۔ ان کے انداز میں نہ کسی سیاسی رہنما جیسی خودنمائی تھی اور نہ خطیبانہ جوش تھا۔

نیویارک، امریکا سے تعلق رکھنے والے یہودی عالم آرتھوڈوکس یہودی فرقہ نیتوری کارتا کے ترجمان ہیں۔ نیتوری کارتا ایک بین الاقوامی یہودی تنظیم ہے جو صیہونیت کی مخالفت کرتی ہے۔

اس فرقے کے مطابق یہودیت ایک مذہب ہے جس کو قومیت کے دائرہ میں بند نہیں کیا جاسکتا ہے۔

ان کا کہنا ہے کہ مذہبی عقیدے کے مطابق مسیح کی آمد سے قبل کسی یہودی ریاست کا قیام یہودی شریعت کے خلاف ہے۔ نیتوری کارتا صیہونیت کو ایک سیاسی تحریک سمجھتی ہے جس نے مذہب کو قوم پرستی میں ڈھال دیا ہے، اور اسی بنیاد پر یہ تنظیم اسرائیلی ریاست کے وجود اور اس کی پالیسیوں کو مسترد کرتی ہے۔

میں جب ربی فیلڈمین کے سامنے بیٹھا تو میرے ذہن میں وہ تمام تصورات موجود تھے جو برسوں سے یہودیت کے بارے میں میرے اندر بٹھا دیے گئے تھے۔ میں بھی یہی سمجھتا رہا تھا کہ یہودی اور صیہونی ہونا ایک ہی بات ہے، کہ شاید تمام یہودی فلسطینیوں کے مخالف اور مسلمانوں سے نفرت کرتے ہیں۔

اسی ذہنی پس منظر کے ساتھ میں نے اُن سے گفتگو شروع کی۔ میں نے پہلا سوال داغا کہ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہودیت اور صیہونیت ایک ہی چیز ہیں۔ میں خود بھی اسی کنفیوژن کا شکار رہا ہوں۔ آپ اس فرق کو کیسے واضح کریں گے؟

ربی فیلڈمین نے سر ہلایا، جیسے وہ اس سوال کے عادی ہوں۔ آہستہ مگر پُراعتماد لہجے میں انہوں نے کہا کہ یہی سب سے بڑی اور سب سے خطرناک غلط فہمی ہے؛

'یہودیت خالصتاً ایک مذہب ہے۔ خدا پر ایمان، اس کے احکامات کی پیروی، اخلاقیات اور روحانیت اس کے جز ہیں۔ اس میں سیاست یا قوم پرستی کی کوئی جگہ نہیں، کیونکہ یہ ایک مذہب ہے، جو عالم گیر ہوتا ہے۔ اس کے برعکس صیہونیت ایک خالص سیاسی اور قومی تحریک ہے، جس نے مذہب کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا۔'

انہوں نے کہا کہ صیہونیت نے یہودی ہونے کی تعریف ہی بدل دی ہے، یہاں تک کہ اب خدا پر ایمان رکھے بغیر بھی خود کو یہودی کہا جاسکتا ہے، بس صرف اسرائیل پر ایمان ہونا چاہیے، جو یہودیت کی بنیادوں کو ہلا دینے کے مترادف ہے۔

یہ وہ نکتہ تھا جہاں مجھے پہلی بار شدّت سے احساس ہوا کہ شاید میں برسوں سے ایک مذہب اور ایک سیاسی نظریے کو ایک ہی خانے میں رکھتا آیا تھا، اور اسی غلطی نے میری سوچ کو محدود کر دیا تھا۔

گفتگو آگے بڑھی تو میں نے ایک اور سوال کیا جو حالیہ برسوں میں بار بار سننے کو ملتا ہے۔ میں نے پوچھا کہ آپ مسیحا کا انتظار کر رہے ہیں۔ میں نے کہیں سنا ہے کہ موجودہ اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو خود کو مسیحا کہتے ہیں۔

ان کے دفتر کی دیوار پر ایک فریم میں ایک سکّہ رکھا ہوا ہے، جو مسجد اقصیٰ کے قریب کھدائی کے دوران ملا ہے اور اس پر نیتن یاہو کندہ ہے۔ اس کو لے کر وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ جس مسیحا کا ذکر مذہبی کتابوں میں ہے، وہ خود ہیں۔ اس دعویٰ کو آپ کیسے دیکھتے ہیں؟

یہ سوال سنتے ہی ربی فیلڈمین کے چہرے پر سنجیدگی مزید

گہری ہوگئی۔

انہوں نے کہا کہ شریعتِ یہود کے ہر قانون کی خلاف ورزی کرنے والا شخص اگر مسیحا ہونے کا دعویٰ کرے تو یہ ایک افسوسناک مذاق ہے۔ انہوں نے نیتن یاہو کا نام لے کر کہا کہ وہ نہ سبت کی پابندی کرتا ہے، نہ کوشر (حلال ذبیحہ) کھانے کا خیال رکھتا ہے، اور نہ ہی مذہبی احکامات پر عمل کرتا ہے۔ ایسے شخص کا یہودیت کی نمائندگی کرنا تو دُور کی بات، مسیحا ہونا ناممکن ہے۔

ان کے الفاظ میں پہلی بار سختی آئی جب انہوں نے کہا کہ جو کچھ نیتن یاہو یا اسرائیل کر رہا ہے، یہ سب خدا کے خلاف کھلی بغاوت ہے، وہ اُن کو اِس کی سزا ضرور دے گا۔

یہاں یہ بات بھی نمایاں تھی کہ ربی فیلڈمین کی مخالفت کسی خاص سیاسی جماعت یا حکومت تک محدود نہیں تھی، بلکہ وہ ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے اس پورے تصور کو چیلنج کر رہے تھے جس میں مذہب کو ریاستی تشدّد کے جواز کے طور پر استعمال کیا جا رہا ہے۔

میں نے پھر وہ سوال اٹھایا جو اکثر فلسطین کے حامیوں یا اسرائیل کے ناقدین سے مغربی دنیا میں کیا جاتا ہے۔ اکثر کہا جاتا ہے کہ اسرائیل کی مخالفت یہودی شناخت سے انکار ہے، اور ایسے لوگوں کو غدار اور اینٹی سیمیٹک کہا جاتا ہے۔ آپ اس الزام کو کیسے دیکھتے ہیں اور کیا آپ کو ایسے الزامات سے واسطہ پڑتا ہے؟

ربی فیلڈمین نے نہایت سکون سے جواب دیا کہ اصل مسئلہ تعریف کا ہے۔ ان کے مطابق یہودی شناخت مذہب سے جڑی ہے، قومیت سے نہیں۔

وہ خود یہودی اس لیے ہیں کہ وہ یہودیت پر عمل کرتے ہیں، اور امریکی اس لیے کہ وہ امریکا کے شہری ہیں۔ اسرائیل پر ایمان رکھنا یا نہ رکھنا کسی کے یہودی ہونے کا پیمانہ نہیں ہے۔

ان کے بقول صیہونیت نے مذہب کی جگہ قوم پرستی کو لا کر یہودیت کو مسخ کر دیا ہے، اور یہی مسخ شدہ تصور دنیا بھر میں نفرت اور تصادم کو جنم دے رہا ہے۔

جنگ عظیم دوم کے دوران جرمن آمر ہٹلر کی طرف سے برپا کیے گئے یہودیوں کے قتل عام یعنی ہولوکاسٹ کا ذکر آیا تو گفتگو مزید بوجھل ہوگئی۔ میں نے پوچھا، بہت سے لوگ کہتے ہیں کہ ہولوکاسٹ کے بعد اسرائیل یہودیوں کو ایک 'تحفّظ' کے طور پر دیا گیا۔ آپ کا خاندان اور برادری بھی اس المیے سے گزری ہے۔ آپ اس دلیل کو کیسے دیکھتے ہیں؟

ربی فیلڈمین نے کہا کہ یہودیوں نے ہولوکاسٹ میں ناقابلِ بیان مظالم سہے، مگر یہ دکھ کسی اور قوم پر ظلم ڈھانے کا جواز نہیں بن سکتا۔

ان کے مطابق، ہولوکاسٹ ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ ظلم کیا ہوتا ہے، نہ یہ کہ ہم خود ظالم بن جائیں۔ جب فلسطینیوں پر مظالم یہودیت کے نام پر کیے جاتے ہیں تو یہ خدا کے نام کی توہین ہے، اور ایک مذہبی یہودی کے لیے اس سے بڑی شرمندگی کوئی نہیں۔ میرا اپنا خاندان ہولوکاسٹ کا شکار ہوگیا ہے، اس لیے مجھے ظلم کی تعریف معلوم ہے اور میں نہیں چاہوں گا کہ اس کرۂ ارض پر کسی اور پر ایسی اُفتاد آن پڑے۔

گفتگو جاری رکھتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اِسی مذہبی احساس اور ضمیر کی آواز نے نیتوری کارتا جیسے گروہوں کو جنم دیا، جو برسوں سے بین المذاہب مکالمے، عالمی فورمز اور عوامی مباحث میں صیہونیت کے مذہبی بیانیے کو چیلنج کرتے آرہے ہیں۔

ربی فیلڈمین خود بھی طویل عرصے سے ان فورمز پر سرگرم ہیں، جہاں وہ فلسطینیوں کے خلاف اسرائیلی پالیسیوں کی مخالفت اور یہودیت کے اصل مذہبی تصور کو واضح کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے وہ آرتھوڈوکس یہودی فکر کے ان قابلِ ذکر نمائندوں میں شمار ہوتے ہیں جو سیاسی صیہونیت کو مسترد کرتے ہیں۔

میں نے اب گفتگو کا رُخ فلسطین کی طرف موڑا۔ میں نے پوچھا کہ ایک یہودی کی حیثیت سے آپ ۱۹۶۷ء کے بعد کی سرحدوں یا دو ریاستی حل کو بھی مسترد کرتے ہیں، جبکہ کئی عرب ممالک اسے تسلیم کر چکے ہیں۔ آپ اسرائیل کے خاتمہ اور مکمل فلسطینی ریاست کے قیام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اس پر تو بیشتر فلسطینی بھی اب زور نہیں دیتے ہیں۔ کیا یہ مدعی سست گواہ چست والا معاملہ تو نہیں ہے؟

ربی فیلڈمین نے کہا کہ مسئلہ ۱۹۶۷ء سے شروع نہیں ہوا بلکہ ۱۹۴۸ء میں ہی ایک بنیادی اخلاقی اور مذہبی جرم سرزد ہوا۔ ان کے مطابق صیہونیت اور فلسطین پر قبضہ ہی اس مسلسل خونریزی کی جڑ ہے۔ انہوں نے یاد دلایا کہ صدیوں تک مختلف مذاہب کے لوگ ایک ساتھ امن سے رہے، اور مذہب کبھی فساد کی وجہ نہیں بنا۔ فساد اُس وقت شروع ہوا جب قوم پرستی کو مذہب کے لبادے میں پیش کیا گیا۔

غزہ کا ذکر آیا تو ان کا لہجہ مزید بھاری ہوگیا۔ انہوں نے کہا کہ جسے دنیا جنگ بندی کہہ رہی ہے، وہ حقیقت میں اختتام نہیں۔

فلسطینیوں کی تکلیف دو برس کی نہیں بلکہ ۷۰ برس پر محیط ہے۔ اسرائیل کا وجود ہی خدا کے خلاف بغاوت کا تسلسل ہے، اور جب تک یہ بغاوت ختم نہیں ہوتی، نہ فلسطین کو سکون ملے گا اور نہ یہودیوں کو۔

چونکہ ربی کا تعلق نیویارک سے ہے، اس لیے میں نے پوچھا کہ آپ کے شہر نے حال ہی میں ایک مسلمان ظہران ممدانی کو میئر منتخب کیا، یہ کیسے ممکن ہو پایا؟

انہوں نے کہا کہ ممدانی کو سماج کے ہر طبقہ نے ووٹ دیا، جس میں یہودیوں کی بھی ایک اچھی تعداد شامل تھی۔ اکثر یہودی اب جاگ رہے ہیں۔ ان کو معلوم ہو رہا ہے کہ ان کے نام پر کیا کیا جا رہا ہے۔

ان کو یہ بھی معلوم ہے کہ کسی وقت اُن کو ہی اسرائیل کی حرکتوں کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ وہ اب آنکھیں بند کر کے اسرائیل کی حمایت کرنے سے گریز کر رہے ہیں۔ دنیا اب جاگ رہی ہے، یہودی بھی جاگ رہے ہیں۔ ہم عنقریب ایک بڑی تبدیلی دیکھیں گے۔

استنبول کی سرد فضا میں یہ گفتگو میرے لیے محض ایک انٹرویو نہیں تھی۔ یہ میرے اپنے ذہن میں موجود کئی تصورات کی شکست تھی۔

سیاہ لباس، سفید داڑھی اور فلسطینی رومال میں ملبوس ربی ڈیوڈ فیلڈمین کسی سیاسی جماعت کے نمائندہ نہیں تھے۔ وہ ایک مذہبی انسان کی حیثیت سے اپنے ضمیر کی گواہی دے رہے تھے، اور میری ایک ایک غلط فہمی کو ٹھہرے ہوئے لہجے، مذہبی دلائل اور ذاتی یقین کے ساتھ کھولتے جا رہے تھے۔

ان کی یہ پیش گوئی کہ عنقریب دنیا ایک بڑی تبدیلی دیکھے گی، شاید یہی اس ملاقات کی اصل معنویت تھی۔

(بحوالہ: ''دی وائر اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۲۵ء)

❁❁❁

بقیہ: بھارت کو ہتھیار بیچنے میں وقت لگے گا!

بھارت کے سرکردہ دفاعی تجزیہ کار راہول بیدی کے بقول دنیا بھر میں جدید اسلحہ سازی کے شعبے میں نجی شعبہ چھا رہا ہے۔ مگر بھارت میں ہتھیار سازی کے کلیدی منصوبے آج بھی سرکاری سیکٹر میں ہیں۔ لہٰذا جب بابو ٹکنیکل کمپیٹیشن کے میدان میں اتریں گے تو بہت دُور اور دیر تک نہیں دوڑ سکتے۔ اس صنعت کو شفاف، اسمارٹ اور سخت مقابلے بازی کا عادی ہونے میں وقت لگے گا۔

(بحوالہ: روزنامہ ''ایکسپریس''، کراچی۔ ۶ جنوری ۲۰۲۶ء)

❁❁❁

وینزویلا پر ٹرمپ کی فوجی مُہم جُوئی

گزشتہ چند مہینوں کے دوران امریکی صدر ڈونلڈ ٹرمپ نے کیریبین میں ایک بڑی فوج تعینات کر رکھی تھی تا کہ وینزویلا کو دباؤ میں لایا جاسکے۔ حالیہ عرصے تک صدر اس عسکری قوت، جس میں ایک طیارہ بردار بحری جہاز، کم از کم ۷ دیگر جنگی جہاز، درجنوں طیارے اور تقریباً ۱۵ ہزار امریکی فوجی شامل تھے، کو چھوٹی کشتیوں پر غیر قانونی حملوں کے لیے استعمال کرتے رہے، جن کے بارے میں ان کا دعویٰ تھا کہ وہ منشیات کی اسمگلنگ کر رہی ہیں۔ تاہم ہفتے کے روز صدر ٹرمپ نے اپنی مہم کو ڈرامائی طور پر وسعت دیتے ہوئے وینزویلا کے صدر نکولس مادورو کو گرفتار کرلیا۔

یقیناً بہت کم لوگ صدر مادورو کے لیے ہمدردی محسوس کریں گے، وہ ایک غیر جمہوری اور جابر حکمران ہیں اور حالیہ برسوں میں مغربی نصف کرّے میں عدم استحکام کا باعث بنے ہیں۔ اقوام متحدہ نے حال ہی میں ایک رپورٹ جاری کی جس میں گزشتہ ایک دہائی کے دوران مادورو کے حامیوں کی جانب سے سیاسی مخالفین کے خلاف قتل، تشدد، جنسی زیادتی اور جبری حراست جیسے سنگین جرائم کی تفصیلات بیان کی گئیں۔ انہوں نے ۲۰۲۴ء کے صدارتی انتخابات میں دھاندلی کی اور تقریباً ۸۰ لاکھ افراد کی بڑے پیمانے پر ہجرت کو ہوا دے کر پورے خطّے میں معاشی اور سیاسی بحران کو جنم دیا۔

اس کے باوجود اگر گزشتہ ایک صدی کی امریکی خارجہ پالیسی سے کوئی بنیادی سبق اخذ کیا جاسکتا ہے تو وہ یہ ہے کہ انتہائی قابلِ نفرت حکومتوں کو بھی بزور طاقت گرانے کی کوشش اکثر معاملات کو مزید خراب کر دیتی ہے۔ امریکا افغانستان میں ۲۰ برس گزارنے کے باوجود ایک مستحکم حکومت قائم کرنے میں ناکام رہا۔ لیبیا میں ایک آمرانہ نظام کے خاتمے کے بعد ریاست بکھر کر رہ گئی۔ ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملے کے تباہ کن اثرات آج بھی امریکا اور مشرقِ وسطیٰ کو جھیلنے پڑ رہے ہیں۔ شاید سب سے زیادہ موزوں مثال یہ ہے کہ امریکا ماضی میں چلی، کیوبا، گوئٹے مالا اور نکاراگوا جیسے لاطینی امریکی ممالک میں بھی حکومتیں گرانے کی کوششوں کے ذریعے عدم استحکام پیدا کر چکا ہے۔

اس تاریخ کے باوجود صدر ٹرمپ نے وینزویلا میں ایک نیشن بلڈنگ منصوبے کے لیے امریکا کو عملاً پابند کر دیا ہے۔ ہفتے کے روز ایک نیوز کانفرنس میں انہوں نے کہا ''ہم ملک کو اُس وقت تک چلائیں گے جب تک ایک محفوظ، مناسب اور دانشمندانہ انتقالِ اقتدار ممکن نہ ہو جائے۔'' تاہم انہوں نے اس حوالے سے کوئی واضح تفصیل فراہم نہیں کی۔ حتیٰ کہ وہ وینزویلا میں اپنی کارروائیوں کے لیے کوئی مربوط جواز بھی پیش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ اگر صدر ٹرمپ کسی دوسرے ملک پر حملے اور اس کے کنٹرول کا مقدمہ پیش کرنا چاہتے ہیں تو امریکی آئین اس کا واضح طریقہ بتاتا ہے یعنی کانگریس سے رجوع کیا جائے، کانگریس کی منظوری کے بغیر ان کے اقدامات امریکی قانون کی خلاف ورزی ہیں۔

انتظامیہ کی جانب سے فوجی مہم جوئی کا ظاہری جواز ''نارکو دہشت گردوں'' کا خاتمہ بتایا جارہا ہے۔ تاریخ میں حکومتیں اکثر حریف ممالک کے رہنماؤں کو دہشت گرد قرار دے کر فوجی مداخلت کو پولیس کارروائی کے طور پر پیش کرتی رہی ہیں۔ اس معاملے میں یہ دعویٰ خاص طور پر مضحکہ خیز ہے، کیونکہ وینزویلا نہ تو فینٹانائل جیسی منشیات کا بڑا پیداواری ملک ہے اور نہ ہی وہ دیگر منشیات وہاں بنتی ہیں۔ وینزویلا میں پیدا ہونے والی کوکین بھی زیادہ تر یورپ جاتی ہے۔ اس کے برعکس صدر ٹرمپ نے انہی دنوں ہونڈارس کے سابق صدر خوان اورلینڈو ہرنینڈز کو معاف کر دیا ہے جو ۲۰۱۴ء سے ۲۰۲۲ء تک ایک وسیع منشیات نیٹ ورک چلاتے رہے تھے۔

وینزویلا پر حملوں کی زیادہ قابلِ یقین وضاحت صدر ٹرمپ کی حال ہی میں جاری کردہ قومی سلامتی کی حکمت عملی میں ملتی ہے، جس میں لاطینی امریکا پر امریکی غلبے کا دعویٰ کیا گیا ہے۔ دستاویز کے مطابق ''کئی برسوں کی غفلت کے بعد امریکا مغربی نصف کرّے میں اپنی برتری بحال کرنے کے لیے منرو ڈاکٹرائن کو دوبارہ نافذ کرے گا۔'' جسے ''ٹرمپ کورولری'' کہا گیا، اس کے تحت دنیا بھر سے فوجیں واپس لا کر خطّے میں تعینات کرنے، سمندروں میں اسمگلنگ روکنے، مہاجرین اور منشیات اسمگلروں کے خلاف مہلک طاقت کے استعمال اور خطے میں مزید امریکی فوجی اڈّے قائم کرنے کا عزم ظاہر کیا گیا۔

بظاہر وینزویلا اس نئے دَور کے سامراجی عزائم کا پہلا نشانہ بن گیا ہے، جو دنیا میں امریکا کے کردار کے لیے ایک خطرناک اور غیر قانونی راستہ ہے۔ بین الاقوامی قانونی جواز، قانونی اختیار یا اندرونی سیاسی تائید کے بغیر آگے بڑھ کر صدر ٹرمپ چین، روس اور دیگر آمرانہ حکومتوں کو اپنے ہمسایوں پر غلبہ حاصل کرنے کا جواز فراہم کر رہے ہیں۔ اس سے بھی بڑھ کر وہ ۲۰۰۳ء میں عراق پر حملے جیسے امریکی تکبّر کو دہرانے کا خطرہ مول لے رہے ہیں۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ بطور صدارتی امیدوار صدر ٹرمپ کبھی فوجی مداخلت کے نقصانات کو تسلیم کرتے دکھائی دیتے تھے۔ ۲۰۱۶ء میں وہ اُن چند ریپبلکن سیاست دانوں میں شامل تھے جنہوں نے جارج ڈبلیو بش کی عراق جنگ کو کھلے عام غلطی قرار دیا۔ ۲۰۲۴ء میں انہوں نے کہا تھا ''میں جنگ شروع نہیں کروں گا، میں جنگیں ختم کروں گا۔''

اب وہ اس اصول کو ترک کر چکے ہیں اور وہ بھی غیر قانونی طور پر۔ امریکی آئین کے مطابق کسی بھی جنگی اقدام کے لیے کانگریس کی منظوری لازمی ہے۔ اگرچہ ماضی میں صدور نے اس قانون کی پر بہت زیادہ عمل نہیں کیا لیکن پھر بھی جارج ڈبلیو بش تک نے عراق پر حملے کے لیے کانگریس سے اجازت حاصل کی تھی۔ ان کے بعد آنے والے صدور نے ڈرون حملوں کے لیے ۲۰۰۱ء کے اس قانون کا سہارا لیا جو ۱۱ ستمبر کے حملوں کے بعد منظور کیا گیا تھا۔ صدر ٹرمپ کے پاس وینزویلا پر حملوں کے لیے ایسا کوئی قانونی سہارا ابھی موجود نہیں۔

فوجی کارروائی پر کانگریس میں بحث جمہوریت میں ایک بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ یہ صدر کو مجبور کرتی ہے کہ وہ عوام کے سامنے اپنے منصوبوں کا دفاع کرے اور ارکین کانگریس کو بھی اپنی ساکھ ان فیصلوں سے جوڑنی پڑتی ہے۔ عراق جنگ کے حق میں ووٹ دینے والے ڈیموکریٹس، جن میں ہلیری کلنٹن اور جان کیری شامل تھے، کو برسوں تک اس کی سیاسی قیمت چکانا پڑی جبکہ برنی سینڈرز اور باراک اوباما جیسے مخالفین کو بعد ازاں دُور اندیش سمجھا گیا۔

وینزویلا کے معاملے میں کانگریس کی بحث صدر ٹرمپ کے جواز کی کمزوری کو بے نقاب کر دیتی۔ انتظامیہ کا دعویٰ ہے کہ چھوٹی کشتیوں سے امریکا کو فوری خطرہ لاحق تھا، مگر متعدد قانونی اور فوجی ماہرین اس دعوے کو مسترد کرتے ہیں۔ اگر منشیات اسمگلنگ ہو بھی رہی ہو تو یہ کسی حکومت کے تختہ الٹنے یا اس کی فوج کو شکست دینے کے مترادف نہیں۔

ہمیں شبہ ہے کہ صدر ٹرمپ نے کانگریس سے منظوری اس لیے نہیں لی کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کی اپنی جماعت کے کچھ ارکان بھی ان کی پالیسی پر سخت شکوک رکھتے ہیں۔ مادورو کی گرفتاری سے قبل ریپبلکن سینیٹرز رینڈ پال اور لیزا مرکوسکی اور ایوان نمائندگان کے رکن ڈون بیکن اور تھامس میسی ایسی قانون سازی کی حمایت کر چکے تھے جو صدر کے وینزویلا کے خلاف فوجی اختیارات کو محدود کرتی۔

////// باقی صفحہ نمبر ۴ \\\\\\

۲۰۲۶ء: پاکستان کو درپیش مسائل اور مُمکنہ حل

ملیحہ لودھی

نئے سال کا آغاز اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ ملک کو درپیش چیلنجز پر سنجیدگی سے غور کیا جائے، بنیادی مسائل کی نشاندہی کی جائے اور یہ سوچا جائے کہ آگے کیا کرنا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ایک ایسا قومی ایجنڈا تشکیل دیا جائے جس پر سیاسی اتفاقِ رائے قائم ہوسکے اور ملک کو پائیدار سیاسی اور معاشی استحکام کی راہ پر ڈالا جاسکے۔

سب سے پہلا کام حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مفاہمت کے ذریعے ایک پُرسکون اور پرامن سیاسی ماحول قائم کرنا ہونا چاہیے۔ منقسم اور شدید طور پر پولرائزڈ قوم کبھی مستحکم ملک نہیں بن سکتی۔ اگرچہ باہمی عدم اعتماد کے باعث یہ مشکل ہے، تاہم سیاسی جماعتوں اور دیگر اسٹیک ہولڈرز کو چاہیے کہ وہ مسلسل کشیدگی اور تصادم کو کم کرنے کی کوشش کریں، کیونکہ یہی صورتِ حال ملک میں بےیقینی اور انتشار پیدا کررہی ہے۔

تحریک انصاف ایک ایسی حکومت سے بات چیت پر آمادگی ظاہر کررہی ہے جسے وہ اب تک جائز نہیں مانتی۔ یہ ایک موقع ہے جو زیادہ دیر قائم نہیں رہ سکتا۔ پیپلز پارٹی کے رہنما بلاول بھٹو زرداری کا حالیہ بیان جس میں انہوں نے سیاسی مفاہمت کی بات کی، ایک مثبت قدم ہے جسے آگے بڑھایا جانا چاہیے۔

حکومت نے وقتاً فوقتاً مذاکرات کی پیشکش تو کی ہے، مگر اس میں سنجیدگی کا فقدان رہا ہے۔ اکثر ایسی پیشکشوں کے ساتھ اپوزیشن کو شیطان صفت بنا کر پیش کرنے والی زبان بھی استعمال کی گئی۔ اس کے علاوہ پارلیمان کو محض ربر اسٹیمپ کے طور پر استعمال کرنا، آئینی ترامیم کو زبردستی منظور کرا کے عدلیہ کی خودمختاری کو کمزور کرنا اور اپوزیشن و اختلافِ رائے کے خلاف کریک ڈاؤن حکومت کے جمہوریت سے عدم احترام کو عیاں کرتا ہے۔

یقیناً سب بڑا مسئلہ اسٹیبلشمنٹ ہے جو بظاہر حکومت اور اپوزیشن کے درمیان مفاہمت کے خیال سے ہم آہنگ نہیں۔ اس کی ترجیح یہی دکھائی دیتی ہے کہ حکومت اپوزیشن کو دباؤ میں رکھے۔ فوجی ترجمان کے حالیہ بیانات اور پریس کانفرنسز، جن میں تحریکِ انصاف کو نشانہ بنایا گیا، ماضی کے مقابلے میں زیادہ سخت ہیں، جو اِس بات کا اشارہ نہیں دیتے کہ اسٹیبلشمنٹ کے رویے میں نرمی آئی ہے۔

اپوزیشن معاشرے کے ایک بڑے طبقے کی نمائندگی کرتی ہے اور اسے ملک بھر میں نمایاں انتخابی حمایت حاصل ہے۔ اسے سیاسی عمل سے باہر رکھنے یا دبانے کی کوششیں سیاسی استحکام پیدا نہیں کرتیں۔ یک طرفہ حکمرانی نہ صرف جمہوریت کو کمزور کرتی ہے بلکہ مؤثر طرزِ حکمرانی کو بھی نقصان پہنچاتی ہے۔ پاکستان کا وفاقی ڈھانچا اس بات کا تقاضا کرتا ہے کہ سیاسی نظام کو اشتراکی بنیادوں پر چلایا جائے، خاص طور پر اس لیے کہ مرکز کو اپوزیشن کی زیرِ قیادت صوبوں کے ساتھ مل کر کام کرنا ہوتا ہے، نہ کہ ان کے خلاف۔

معاشی بحالی یقینی طور پر قومی ایجنڈے میں سرفہرست ہونی چاہیے۔ اگرچہ حکومت نے آئی ایم ایف بیل آؤٹ اور دیگر بیرونی وسائل کی مدد سے میکرو اکنامک استحکام میں کسی حد تک کامیابی حاصل کی ہے، مگر یہ ایک قلیل مدتی فائدہ ہے جو غیر پائیدار عوامل پر مبنی ہے۔

قرضوں کا بوجھ بہت زیادہ ہے اور آئندہ پانچ برسوں میں تقریباً ۲۳۰ ارب ڈالر کی بیرونی مالی ضروریات کے مقابلے میں زرِمبادلہ کے ذخائر کم ہیں۔ ٹیکس نظام، اخراجات اور توانائی کے شعبے میں ساختی اصلاحات تاحال مؤثر طور پر نافذ نہیں ہوسکیں۔ پی آئی اے کی نجکاری ایک مثبت پیشرفت ہے، مگر دیگر خسارے میں چلنے والے سرکاری اداروں کی نجکاری کے لیے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے۔

ابھی تک ایسا کوئی قابلِ اعتماد منصوبہ سامنے نہیں آیا جو پاکستان کو کمزور معاشی نمو، کم بچت و سرمایہ کاری، بلند خساروں اور بڑھتے قرضوں کے جال سے نکال سکے۔

سرمایہ کاری، بشمول غیر ملکی سرمایہ کاری جمود کا شکار ہے۔ یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ پاکستان کا موجودہ معاشی ماڈل کارآمد نہیں۔ قرضوں پر مبنی وقتی معاشی بہتری پائیدار نہیں ہوسکتی۔ جب تک یہ حکمتِ عملی تبدیل نہیں ہوتی، استحکام سے ترقی کی جانب سفر ممکن نہیں۔ تمام اسٹیک ہولڈرز کو مل کر ایک نیا معاشی منصوبہ تشکیل دینا ہوگا جو ساختی مسائل کو مؤخر کرنے کے بجائے حل کرے۔ گزشتہ چار دہائیوں سے کمزور معاشی نمو کی ایماندارانہ تشخیص ناگزیر ہے۔

انسانی ترقی میں سرمایہ کاری کو قومی ایجنڈے میں اعلیٰ ترجیح ملنی چاہیے، مگر ایسا نہیں ہورہا، حالانکہ ملک کی ترقی کے امکانات انسانی سرمائے میں کم سرمایہ کاری کے باعث شدید طور پر محدود ہوچکے ہیں۔

آج پاکستان ایک سنگین انسانی ترقی کے بحران سے دوچار ہے، جس کا اظہار خواندگی، تعلیم، صحت، غربت اور صنفی عدم مساوات سمیت تقریباً تمام اشاریوں میں بگاڑ کی صورت میں ہورہا ہے۔ ۲۰ ملین سے زائد بچوں کا اسکول سے باہر ہونا ایک قومی المیہ ہے۔ خواندگی کی شرح ۶۰ فیصد پر جمود کا شکار ہے، یعنی ۴۰ فیصد آبادی ناخواندہ ہے اور اس سطح کی ناخواندگی کے ساتھ معاشی ترقی ممکن نہیں۔

غربت کی شرح بھی تشویشناک حد تک بڑھ چکی ہے اور عالمی بینک کے مطابق یہ ۴۴ فیصد تک پہنچ گئی ہے۔ صحت کے اشاریے بھی جنوبی ایشیا کے بدترین اعداد و شمار میں شامل ہیں۔ غذائی قلت اور غربت کا ایک سنگین نتیجہ بچوں میں قد کی کمی ہے، جہاں پانچ سال سے کم عمر تقریباً ۴۰ فیصد بچے اس مسئلے کا شکار ہیں۔

آبادی میں بےقابو اضافہ اور اس اہم مسئلے پر حکومتی عدم توجہی انسانی ترقی کے بحران کو مزید سنگین کررہی ہے۔ سالانہ تقریباً ۲٫۵ فیصد آبادی بڑھنے کا مطلب ہے کہ ہر سال قریباً ۶۰ لاکھ بچے آبادی میں شامل ہورہے ہیں، جو وسائل، انفرااسٹرکچر، روزگار، صحت اور تعلیم پر شدید دباؤ ڈال رہا ہے۔

آبادی پر قابو پانے کی پالیسیاں فوری طور پر درکار ہیں۔ خطے کے تقریباً تمام ممالک نے خاندانی منصوبہ بندی کی پالیسیاں کامیابی سے نافذ کی ہیں، مگر پاکستان اب تک ناکام رہا ہے۔ اگر جامع آبادی کنٹرول پالیسی نہ اپنائی گئی تو ملک ایک بڑے آبادیاتی بحران کی طرف بڑھ رہا ہے، جہاں اَن پڑھ اور بےروزگار نوجوان سماجی و سیاسی عدم استحکام کو جنم دیں گے۔

دہشت گردی اور شدت پسندی سے نمٹنا بھی فوری ترجیح ہونی چاہیے۔ گزشتہ برس شدت پسند تشدد میں اضافہ ہوا اور دہشت گردی سے ہونے والی ہلاکتیں ایک دہائی کی بلند ترین سطح پر پہنچ گئیں۔ اس کے لیے ایک جامع قومی حکمتِ عملی درکار ہے جس میں محض فوجی کارروائیوں پر انحصار نہ ہو بلکہ سماجی، معاشی اور سیاسی اقدامات اور مقامی برادری کی شمولیت بھی شامل ہو۔

یہ تمام چیلنجز سیاسی قیادت کے لیے ایک کڑا امتحان ہیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا وہ اپنے تنگ نظری پر مبنی مفادات سے بالاتر ہوکر ان مسائل سے نمٹ سکیں گے جو ملک کے مستقبل کا تعین کریں گے؟

"A national agenda for 2026."
(Daily "Dawn" Karachi. January 5, 2026)

مصنوعی ذہانت: تیل کی طلب میں اضافہ؟

انس بن فیصل الحجی

جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی، بین الاقوامی توانائی ایجنسی اور انرجی انفارمیشن ایڈمنسٹریشن نے ۲۰۲۶ء کے دوران عالمی سطح پر تیل کی طلب میں اضافے کی پیش گوئی کی ہے۔ دونوں عالمی اداروں نے اپنی پیش گوئیوں میں تقریباً ایک لاکھ بیرل یومیہ کا اضافہ کیا ہے۔

بین الاقوامی توانائی ایجنسی اب تیل کی طلب میں ۹۰ء۰ ملین بیرل یومیہ اضافے کی پیش گوئی کر رہی ہے جبکہ انرجی انفارمیشن ایڈمنسٹریشن کے مطابق یہ اضافہ ۱۴ء۱ ملین بیرل یومیہ ہوسکتا ہے۔

دوسری جانب اوپیک نے اپنا تخمینہ برقرار رکھتے ہوئے ۴۴ء۱ ملین بیرل یومیہ اضافے کا اندازہ دیا ہے۔ ایسے شواہد موجود ہیں جو اس بات کی تائید کرتے ہیں کہ عالمی تیل کی طلب انرجی انفارمیشن ایڈمنسٹریشن اور اوپیک کے اندازوں کے درمیان بڑھے گی، تاہم ایک ایسا منظرنامہ بھی ہے جو طلب کے اوپیک کے اندازوں پر پورا اتر سکتا ہے۔ یہ منظرنامہ بجلی کی طلب میں موجود رجحانات سے جڑا ہے۔ سوال یہ ہے کہ تیل کی طلب کا بجلی کی پیداوار سے کیا تعلق ہے؟

ابتدائی طور پر یہ واضح ہے کہ بجلی کے شعبے میں تیل کا استعمال بہت محدود ہے اور یہ عالمی تیل کی طلب کا تقریباً چار فیصد یا اس سے بھی کم ہے۔ یہ استعمال زیادہ تر تیل پیدا کرنے والے ممالک، دُور دراز علاقوں اور غریب ممالک تک محدود ہے۔ بھارت اور چین جیسی بڑی معیشتوں میں بجلی پیدا کرنے میں تیل کا کردار نہایت معمولی ہے اور بیشتر ممالک میں یہ ایک فیصد سے بھی کم ہے۔ ماحولیاتی، معاشی اور تزویراتی وجوہات کی بنا پر توقع ہے کہ بجلی کے شعبے میں تیل کا کردار مزید کم ہوگا اور اس کی جگہ گیس اور قابل تجدید توانائی لے گی۔

دوسرے لفظوں میں، اگر یورپی ممالک، بھارت اور چین ہوا اور شمسی توانائی کی پیداواری صلاحیت کو دوگنا بھی کر دیں تو بھی اس کا تیل کی طلب پر اثر نہ ہونے کے برابر ہوگا۔

اگرچہ تیل کی طلب میں اضافے کے اندازوں میں اختلاف ہے لیکن اس بات پر سب کا اتفاق ہے کہ تیل کی طلب میں زیادہ تر اضافہ ابھرتی اور ترقی پذیر معیشتوں سے آئے گا۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ بین الاقوامی توانائی ایجنسی اب بھی او ای سی ڈی ممالک، خاص طور پر یورپ، میں تیل کی طلب کے حوالے سے محتاط بلکہ مایوس کن اندازہ رکھتی ہے جہاں وہ منفی نمو کی توقع کر رہی ہے، حالانکہ زمینی حقائق اس کے برعکس ہیں۔

تاریخی اعداد و شمار بتاتے ہیں کہ بین الاقوامی توانائی ایجنسی نے مسلسل امریکی تیل کی طلب کو کم کر کے دکھایا ہے، خاص طور پر رواں سال، جب اس نے دو مرتبہ اپنے اندازے اوپر کی جانب درست کیے۔ اسی لیے امکان ہے کہ او ای سی ڈی ممالک، بالخصوص یورپ، میں تیل کی طلب کی حقیقی نمو ایجنسی کے اندازوں سے زیادہ ہوگی۔

کالم کا مرکزی خیال یہ ہے کہ ایک ایسا ممکنہ منظرنامہ موجود ہے جس میں تیل کی طلب زیادہ تر اندازوں، بلکہ شاید سبھی اندازوں سے بھی بڑھ سکتی ہے۔ اس کی وجہ مصنوعی ذہانت اور ڈیٹا سینٹرز کی جانب سے بجلی کی تیزی سے بڑھتی ہوئی طلب ہے، جو بجلی گھروں کی پیداواری صلاحیت سے تجاوز کر سکتی ہے۔

مسئلہ یہ ہے کہ اے آئی کمپنیوں کی بجلی کی طلب بہت تیزی سے بڑھ رہی ہے جبکہ بجلی فراہم کرنے والی کمپنیاں کئی وجوہات کی بنا پر اتنی تیزی سے نئے بجلی گھر تعمیر نہیں کر سکتیں۔ ان وجوہات میں اجازت نامے، قوانین، مالی وسائل، گیس کی ترسیلی بنیادی ڈھانچے کی مشکلات اور سب سے بڑھ کر گیس ٹربائن بنانے والی کمپنیوں کی محدود پیداواری صلاحیت شامل ہے۔ صورتِ حال یہ ہے کہ اگر آج کوئی کمپنی نئی گیس ٹربائن کا آرڈر دے تو اسے کم از کم تین سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔

اس کا فوری حل کوئلے کے استعمال کی طرف واپسی اور موجودہ بجلی گھروں کی پیداوار میں اضافہ ہے مگر یہ بھی کافی نہیں۔ نئے جوہری توانائی کے منصوبوں کو مکمل ہونے میں کئی سال لگتے ہیں۔ تو پھر موجودہ وقت میں حل کیا ہے؟

حل یہ ہے کہ وہ کمپنیاں جو ہنگامی حالات کے لیے تیل سے چلنے والے پرانے بجلی گھر رکھتی ہیں، انہیں مستقل بنیادوں پر چلانا شروع کر دیں، جس سے تیل کی طلب میں اضافہ ہوگا۔ ایسے پرانے پاور پلانٹس کچھ یورپی ممالک اور امریکا کے شمال مشرقی علاقوں میں موجود ہیں، جہاں آبادی زیادہ ہے۔ تاہم بہت سے علاقوں میں ایسے پلانٹس موجود ہی نہیں، تو وہاں کیا حل ہے؟

وہاں حل نجی بجلی پیداوار ہے۔ اس کے تحت کمپنیاں بڑے سائز کے جنریٹر خریدتی ہیں، جن میں سے ہر ایک کا حجم ایک درمیانے کمرے کے برابر ہوتا ہے، اور انہیں ڈیزل یا مائع گیس سے چلاتی ہیں۔ اگر دنیا بھر میں سیکڑوں یا شاید ہزاروں ایسے جنریٹر چلائے گئے تو اس سے عالمی تیل کی طلب اندازوں سے کہیں زیادہ بڑھ سکتی ہے۔ ماضی میں چین اور امریکا میں بجلی کی قلت کے دوران ایسا ہو چکا ہے۔

اس منظرنامے کا ایک اہم نتیجہ یہ ہوگا کہ نہ صرف تیل کی مجموعی طلب بڑھے گی بلکہ وہ بڑا متوقع فاضل ذخیرہ بھی کم ہو جائے گا جس کی پیش گوئی بین الاقوامی توانائی ایجنسی اور اس کے حامی کرتے ہیں۔ خاص طور پر او ای سی ڈی ممالک کی منڈیوں، بالخصوص امریکا اور یورپ میں، تیل کے استعمال میں اضافے کے ذریعے۔ یہ براہِ راست ایجنسی کے اس بیانیے کے خلاف ہے کہ او ای سی ڈی ممالک میں تیل کی طلب کم ہو رہی ہے۔ دوسرے لفظوں میں، یہ منظرنامہ بین الاقوامی توانائی ایجنسی کی پیش گوئیوں کو دو حوالوں سے چیلنج کرتا ہے: ایک تو طلب کی سطح کے لحاظ سے، اور دوسرا یہ کہ یہ اضافہ صنعتی ممالک میں ہوگا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ۲۰۲۶ء کے لیے تیل کی منڈیوں کی صورتِ حال مایوس کن اندازوں کے مقابلے میں زیادہ مثبت ہے، تاہم اس سے قیمتوں میں نمایاں بہتری اُسی صورت آئے گی جب توانائی کے شعبے میں تیل کے استعمال میں واضح اضافہ ہو۔

توقع ہے کہ ۲۰۲۶ء کے دوران برینٹ خام تیل کی قیمتیں ساٹھ ڈالر فی بیرل کے آس پاس رہیں گی، اگرچہ اس حد کے اندر وقتی اتار چڑھاؤ ممکن ہے۔ دوسرے لفظوں میں، تیل کی قیمتوں میں بڑی گراوٹ کے حوالے سے مضبوط شواہد موجود نہیں ہیں، جیسا کہ بعض لوگ دعویٰ کرتے ہیں۔

وینزویلا کے تیل کی کمی کا اثر محدود ہے اور اس کا اثر مجموعی قیمتوں کے بجائے تیل کے معیار سے جڑی قیمتوں کے فرق پر زیادہ پڑتا ہے۔ روس پر مزید پابندیاں لاجسٹک معاملات کو ضرور پیچیدہ بنا سکتی ہیں مگر ان سے منڈی کے توازن میں بنیادی تبدیلی آنے کا امکان کم ہے، اس لیے قیمتوں پر ان کا اثر بھی محدود ہی رہے گا۔

ایک بات طے ہے کہ اگر برینٹ کروڈ کی قیمت ۷۰ ڈالر فی بیرل سے اوپر جاتی ہے تو چین اپنے بڑے ذخائر سے تیل نکالے گا جو اس نے ایران، روس اور وینزویلا سے کم قیمتوں پر خریدا ہوا ہے تاکہ قیمتوں میں اضافے کو روکا جا سکے۔

تاہم امریکا اور چین کے درمیان اگر کوئی جامع اور دیرپا تجارتی معاہدہ طے پا جاتا ہے تو اس کا اثر بہت زیادہ مثبت ہوگا اور تیل کی طلب میں نمایاں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں چین کی جانب سے اپنے ذخائر سے تیل نکالنے کا اثر تجارتی معاہدے کی عدم موجودگی کی صورتِ حال کے مقابلے میں عارضی ہوگا۔

(بحوالہ: ''انڈی پنڈنٹ اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۴ دسمبر ۲۰۲۶ء)

اسرائیل کا 'صومالی لینڈ' کو تسلیم کرنے کا فیصلہ

اسرائیل دنیا کا پہلا ملک بن گیا ہے جس نے باضابطہ طور پر صومالیہ کے علیحدگی پسند خطے 'صومالی لینڈ' کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم کرلیا ہے۔

اسرائیلی وزیراعظم بنیامن نیتن یاہو نے اعلان کیا کہ 'اسرائیل زرعی شعبے، صحت اور ٹیکنالوجی میں فوری طور پر تعاون کو وسعت دے گا۔' صومالی لینڈ کے صدر عبدالرحمٰن محمد عبداللہی نے اس پیشرفت کو 'ایک تاریخی لمحہ' قرار دیا۔

ماہرین کے مطابق اسرائیل کی جانب سے تسلیم کیے جانے سے دیگر ممالک کو بھی ایسا کرنے کی ترغیب مل سکتی ہے، جس سے صومالی لینڈ کی سفارتی حیثیت اور بین الاقوامی منڈیوں تک رسائی میں اضافہ ہوگا۔

دوسری جانب صومالیہ کے وزیراعظم حمزہ عبدی بری نے اس اقدام کو سختی سے مسترد کرتے ہوئے کہا کہ ان کا ملک اسے اپنی خودمختاری پر 'ایک دانستہ حملہ' سمجھتا ہے۔

صومالی لینڈ خلیج عدن پر ایک اسٹریٹجک اہمیت کا حامل علاقہ ہے اور اس کی اپنی کرنسی، پاسپورٹ اور پولیس فورس موجود ہے۔ یہ ۱۹۹۱ء میں سابق آمر جنرل سیاد بری کے خلاف آزادی کی جنگ کے بعد وجود میں آیا اور تب سے دہائیوں کی تنہائی کا شکار رہا ہے۔

تقریباً ۶۰ لاکھ آبادی کے ساتھ، خود کو جمہوریہ کہلانے والا خطہ حالیہ برسوں میں صومالیہ، ایتھوپیا اور مصر کے درمیان کئی علاقائی تنازعات کا مرکز رہا ہے۔

گزشتہ سال خشکی میں گھرا ہوا ملک ایتھوپیا اور صومالی لینڈ کے درمیان ایک معاہدہ ہوا جس کے تحت ایتھوپیا کو ساحل کی ایک پٹی بندرگاہ اور فوجی اڈّے کے طور پر لیز پر دی گئی، جس کی وجہ سے صومالیہ کی جانب سے شدید ناراضی کا اظہار کیا گیا۔

صومالی لینڈ کے صدر عبداللہی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ ان کا ملک ابراہم معاہدوں میں شامل ہوگا، جسے انہوں نے علاقائی اور عالمی امن کی جانب ایک قدم قرار دیا۔

واضح رہے کہ ۲۰۲۰ء میں بحرین، متحدہ عرب امارات، مراکش اور سوڈان نے اسرائیل کے ساتھ اپنے سفارتی تعلقات کو معمول پر لانے کے لیے امریکی معاونت کے ساتھ ایک معاہدہ کیا تھا جسے 'ابراہم اکارڈز' بھی کہا جاتا ہے۔ اس وقت تک صرف دو عرب ممالک مصر اور اردن نے اسرائیل کے ساتھ امن معاہدہ کیا ہوا تھا۔

صومالی لینڈ کے صدر نے مزید کہا کہ 'صومالی لینڈ شراکت داری قائم کرنے، باہمی خوشحالی کو فروغ دینے اور مشرقِ وسطیٰ و افریقا میں استحکام کو آگے بڑھانے کے لیے پرعزم ہے۔'

صومالیہ کے علیحدگی پسند خطّے 'صومالی لینڈ' کو ایک آزاد ملک کے طور پر تسلیم کرنے کے اس فیصلے کی مذمت صومالیہ، مصر، ترکی اور جبوتی کے وزرائے خارجہ نے کی ہے، جنہوں نے ایک مشترکہ بیان میں اسرائیل کے اعلان کو مکمل طور پر مسترد کیا۔

اسرائیل کے وزیرِ خارجہ گیڈون سار نے ایکس پر ایک بیان میں کہا کہ دونوں ممالک نے 'مکمل سفارتی تعلقات قائم کرنے پر اتفاق کیا ہے جس میں سفیروں کی تقرری اور سفارت خانوں کا قیام شامل ہوگا۔'

انہوں نے مزید کہا کہ 'میں نے اپنی وزارت کو ہدایت دی ہے کہ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات کو ادارہ جاتی شکل دینے کے لیے فوری طور پر وسیع شعبوں میں اقدامات کیے جائیں۔'

مصر کے وزیرِ خارجہ نے صومالیہ، ترکی اور جبوتی کے ہم منصبوں سے الگ الگ ٹیلیفونک گفتگو کی جس میں اسرائیل کے حالیہ اعلان سمیت مختلف امور پر تبادلۂ خیال کیا گیا۔

مصر کی وزارتِ خارجہ کے بیان کے مطابق چاروں ممالک نے صومالیہ کی خودمختاری اور علاقائی سالمیت کی حمایت کا اعادہ کیا اور خبردار کیا کہ یکطرفہ اقدامات خطّے کے استحکام کو نقصان پہنچا سکتے ہیں یا صومالیہ کے ریاستی اداروں کے متوازی ڈھانچے قائم کر سکتے ہیں۔

وزرائے خارجہ نے مزید کہا کہ خودمختار ریاستوں کے حصّوں کو آزاد تسلیم کرنا بین الاقوامی قانون اور اقوامِ متحدہ کے چارٹر کے تحت ایک خطرناک مثال قائم کرے گا۔

واضح رہے کہ اسرائیل کئی برسوں سے مشرقِ وسطیٰ اور افریقا کے ممالک کے ساتھ تعلقات مضبوط کرنے کی کوشش کر رہا ہے لیکن حالیہ جنگیں، بشمول غزہ اور ایران کے خلاف جمہوریت کے لیے رکاوٹ سمجھی جارہی ہیں۔

تاریخی معاہدے جو ۲۰۲۰ء میں صدر ٹرمپ کی پہلی مدت کے آخر میں ہوئے اور 'ابراہام معاہدے' کہلائے، کے تحت کئی ممالک بشمول مسلم اکثریتی متحدہ عرب امارات اور مراکش نے اسرائیل کے ساتھ تعلقات معمول پر لائے، جبکہ دیگر ممالک بعد میں شامل ہوئے۔

صومالیہ کی تاریخ اور اس کی خانہ جنگی کا ذکر کرنا اس لیے ضروری ہے تاکہ یہ سمجھا جاسکے کہ اس کے اندر ایک علیحدگی پسند ریاست 'صومالی لینڈ' کیوں وجود میں آئی اور ایک دوسرا نیم خودمختار خطّہ 'پونٹ لینڈ' کیسے سامنے آیا۔

صومالیہ مشرقی افریقا کے ساحل پر واقع ہے۔ اس کے شمال میں خلیج عدن اور جبوتی، مغرب میں ایتھوپیا، مشرق میں بحرِ ہند اور جنوب میں کینیا واقع ہیں۔

انیسویں صدی میں یورپی نوآبادیاتی طاقتیں آہستہ آہستہ صومالیہ پر قابض ہوئیں۔ ملک کا بڑا حصہ اطالوی حکمرانی میں آیا جبکہ شمال مغربی علاقہ برطانوی کنٹرول میں رہا۔

صومالیہ نے ۱۹۶۰ء میں آزادی حاصل کی جب اطالوی زیرِانتظام اور برطانوی زیرِانتظام علاقوں کو ملا کر 'متحدہ جمہوریہ صومالیہ' تشکیل دی گئی۔

۱۹۶۹ء میں محمد سیاد بری نے منتخب صدر عبدالرشید شارمارکے کے قتل کے بعد فوجی بغاوت کی قیادت کی اور صومالیہ کو ایک اشتراکی ریاست قرار دے کر اس کے بیشتر معاشی وسائل کو قومی ملکیت میں لے لیا۔

سیاد بری کی ۲۲ سالہ حکمرانی کے دوران ملک مسلسل شورش، بغاوت اور تنازعات کا شکار رہا جو بالآخر ۱۹۹۱ء میں اُن کی برطرفی پر ختم ہوئی۔ اس کے بعد ملک دہائیوں تک خانہ جنگی میں مبتلا رہا جس میں مختلف قبائل کے جنگی سردار اور کمزور مرکزی حکومت آمنے سامنے تھے۔

اسی سال شمالی علاقہ، جو پہلے برطانوی نوآبادیاتی کنٹرول میں تھا، نے یکطرفہ طور پر آزادی کا اعلان کیا اور 'جمہوریہ صومالی لینڈ' وجود میں آئی۔ تاہم یہ ریاست کسی ملک یا عالمی ادارے کی جانب سے تسلیم نہ کی گئی، سوائے اسرائیل کے جس نے اب ۲۶ دسمبر ۲۰۲۵ء کو اسے تسلیم کیا ہے۔

۱۹۹۸ء میں پونٹ لینڈ نے خودمختار انتظامی نظام کا اعلان کیا۔ تاہم صومالی لینڈ کے برعکس پونٹ لینڈ نے مکمل آزادی کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ صومالیہ کا حصہ رہتے ہوئے خودمختاری کو ترجیح دی۔

(بحوالہ: ''بی بی سی اردو ڈاٹ کام''۔ ۲۷ دسمبر ۲۰۲۵ء)

MA'ARIF FEATURE - Publisher:Shahid Hashmi; Printer:Hassan M.Abbasi,City Press,Karachi; Office:D-35,Block-5,F.B.Area,Karachi-75950